فہرست

شذرات	روزے کے اثرات	منظور الحسن	۲
	رمضان کا مہینا ـــــ حاصل کیا کرنا ہے؟	ریحان احمد یوسفی	۸
قرآنیات	آل عمران (۳: ۳۸۔۴۱)	جاوید احمد غامدی	۱۳
معارف نبوی	احرام باندھتے وقت خوشبو کا استعمال	معز امجد/اظہار احمد	۱۷
	ہمارا دین	طالب محسن	۲۰
	نماز کے اوقات	ساجد حمید	۳۷
دین و دانش	قانون عبادات (۱۴)	جاوید احمد غامدی	۴۳
مکاتیب	مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ	محمد عزیر بھور، آفتاب عروج/ عمار خان ناصر	۵۱

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

منظورالحسن

روزے کے اثرات

اس گھڑی ہم جی رہے ہیں، مگر اگلی کسی گھڑی ہمیں مرجانا ہے۔ جس طرح یہ جینا سدا کا جینا نہیں ہے، اسی طرح وہ مرنا بھی سدا کا مرنا نہیں ہوگا۔ ایک دن ہم اسی روح و بدن کے ساتھ ایک دوسری دنیا میں کھڑے ہوں گے۔ پروردگار کا فرمان ہے کہ: ''اس دن ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ کتنے چہرے اس دن روشن ہوں گے، ہنستے ہوئے ہشاش بشاش! اور کتنے چہرے ہوں گے کہ ان پر خاک اڑتی ہوگی، سیاہی چھا رہی ہوگی۔'' اس روز آخری عدالت لگے گی۔ ہم سب کے اعمال نامے کھولے جائیں گے۔ ان اعمال ناموں میں ''جس نے ذرہ برابر بھلائی کی ہے، وہ بھی اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہے، وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔'' اور پھر جن کی فہرست اعمال میں نیکیاں زیادہ ہوں گی، وہ کامیاب اور جنت کے مستحق ٹھہریں گے اور جن کی فہرست اعمال میں گناہ زیادہ ہوں گے وہ مجرم اور جہنم کے سزاوار قرار پائیں گے۔ اس موقع پر ان مجرموں میں سے ہر ''مجرم کہے گا کہ اے کاش، وہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے، اپنے بیٹوں کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو، اپنے خاندان کو جو اسے پناہ دیتا رہا اور اس زمین کے ہر شخص کو فدیہ میں دے دے، پھر اپنے آپ کو اس سے چھڑا لے''، مگر وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔ آخرت کا گھر بس انھی لوگوں کے لیے بہتر قرار پائے گا جنھوں نے دنیا کی زندگی نفس کی خواہشوں پر قابو رکھتے ہوئے اور اپنے پروردگار کے حضور میں پیشی سے ڈرتے ہوئے گزاری ہوگی، گویا انھوں نے تقوے کی راہ اختیار کی ہوگی اور عمر بھر اپنے پروردگار کی اس بات کو مشعل راہ بنایا ہوگا کہ:

''دار آخرت بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں۔'' (الاعراف ۷:۱۶۹)

ہم میں سے ہر شخص اس دن جہنم کے دردناک عذاب سے بچنا چاہتا ہے اور دار آخرت میں بہتری کا طلب گار ہے، مگر ہمیں یہ بات جان رکھنی چاہیے کہ دار آخرت میں کامیابی اور بہتری کا صرف اور صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ راستہ تقویٰ ہے۔ ہمیں اس پر گام زن ہونے کے لیے ہر ممکن طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے موثر طریقہ

روزہ ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

''ایمان والو، تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔''

(البقرہ ۲: ۱۸۳)

روزہ ہمارے عمل، ہمارے اخلاق اور ہماری روح پر ایسے اثرات مرتب کرتا ہے کہ ہمارے لیے شیطان کی ترغیبات اور نفس کے داعیات کے باوجود تقوے کی نشوونما ممکن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ رمضان کے دوران میں ہمیں اس بات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ آیا ہم روزے کے ان اثرات سے فی الواقع فیض یاب ہو بھی رہے ہیں یا نہیں۔ اگر روزے ہمارے اندر تقوے کو پروان نہیں چڑھا رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے کھانے پینے کے اوقات میں تبدیلی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں کیا۔ روزہ ہماری عملی، اخلاقی اور روحانی زندگی پر جو اثرات قائم کرتا ہے، ان میں سے چند یہ ہیں۔

نمازوں میں سرگرمی

اپنے مالک کے حضور میں سربسجود ہونا انسان کی معراج ہے۔ نماز اصل میں، ان نعمتوں پر شکر کا اظہار ہے جو پروردگار نے انسان کو کسی استحقاق کے بغیر دی ہیں، اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ دنیا کا کارساز صرف اور صرف وہی ہے، اس بات کا اقرار ہے کہ ہماری محبت کا مرکز حقیقی وہی ہے، اس امر کی تائید ہے کہ اطاعت کا مرجع اسی کی ذات ہے اور اس مسلمے کا ادراک ہے کہ جو کچھ ملے گا اسی کے در سے ملے گا۔ دوسرے الفاظ میں نماز انسان کی طرف سے بندگی رب کا بھرپور اظہار ہے۔ رمضان میں چونکہ پورا ماحول اللہ تعالیٰ کی عبادت میں سرگرم ہوتا ہے، اس لیے ہر شخص کے اندر عبادت کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ یہ مہینا ہمیں یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ ہم رضاے الٰہی کی جستجو میں نماز کو اپنے معمولات کا سب سے اہم حصہ بنائیں۔ اس ضمن میں ہمیں سہ جہتی منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔ ایک یہ کہ اس کی حتی المقدور کوشش کی جائے کہ فرض نمازیں کسی حال میں قضا نہ ہوں اور مسجد میں باجماعت نماز کا التزام کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ فرض نمازوں کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ نوافل ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ تیسرے یہ کہ تہجد کی نماز کو اس مہینے میں اپنا معمول بنا لیا جائے۔ اگرچہ اس بات کی روایت پڑ گئی ہے کہ رمضان میں تہجد کی نماز عشا کے ساتھ ہی تراویح کے نام سے پڑھ لی جاتی ہے، مگر اس کا اصل طریقہ یہ ہے کہ اسے تنہائی میں اور رات کا کچھ حصہ گزر جانے کے بعد پڑھا جائے۔ رمضان میں اس کی اس قدر اہمیت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص رمضان کی راتوں میں اپنے ایمان کو قائم رکھتے ہوئے ثواب کی نیت سے (تہجد کی نماز پڑھنے کے لیے) کھڑا رہا، اس کے تمام اگلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔'' (بخاری، رقم ۱۸۸۵)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مطالعۂ قرآن

رمضان میں مطالعۂ قرآن کی اہمیت دو پہلوؤں سے ہے۔ایک یہ کہ یہ وہ بابرکت مہینا ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''یہ رمضان کا مہینا ہے جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ۔'' (البقرہ۲: ۱۸۵)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ماہ رمضان کی قرآن مجید سے خاص مناسبت ہے۔

دوسرے یہ کہ اس مہینے میں خدا کی بات سننے اور سمجھنے کی طلب ہر دل میں پیدا ہوتی ہے اور خلوت میسر ہونے اور روزمرہ مصروفیات میں کمی کی وجہ سے فہم قرآن کا پورا موقع میسر آ جاتا ہے۔اس موقع سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے قرآن مجید کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کرنی چاہیے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ تلاوت سے مراد قرآن مجید کو بے سوچے سمجھے پڑھنا نہیں ہے، بلکہ نہایت غور وفکر کے ساتھ مطالعہ کرنا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

انفاق

اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا انفاق ہے۔آخرت کی کامیابی کے حوالے سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بہت اہمیت ہے۔قرآن مجید میں ارشاد ہے:

''ہم نے جو کچھ تمھیں بخشا ہے، اس میں سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت آ دھمکے۔ پھر وہ حسرت سے کہے کہ اے رب، تو نے مجھے کچھ اور مہلت کیوں نہ دی کہ میں صدقہ کرتا اور نیکوکاروں میں سے بنتا۔''

(المنافقون۶۳: ۹۔۱۰)

گویا اللہ کی یاد کو قائم رکھنے، مال و اولاد کے فتنوں سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اس کے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کیا جائے۔

رمضان میں اس نیکی کا بھرپور اظہار ہونا چاہیے۔اس موقع پر اپنے اعزہ پر، اپنے ہمسائیوں پر، اپنے ہم وطنوں پر اور ناداروں اور ضرورت مندوں پر جس قدر ممکن ہو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے۔رمضان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انفاق کے حوالے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بہت سخاوت کرتے تھے۔آپ کی سخاوت چلتی ہوئی ہوا سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔''

(مشکوٰۃ، رقم ۱۹۹۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو عام حالات میں بھی سب سے زیادہ فیاض تھے، لیکن رمضان میں تو آپ سراپا جود و کرم بن جاتے۔“ (متفق علیہ)

رمضان میں انفاق کی ایک صورت روزہ دار کو روزہ افطار کرانا بھی ہے۔ حضرت زید بن خالد جہنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

”جس نے کسی روزہ دار کو افطار کرایا، اس کے لیے روزہ دار کے برابر اجر ہے اور اس سے روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔“ (ترمذی، کتاب الصوم)

نفس پر قابو

شیطان انسان پر جن راستوں سے زیادہ تاخت کرتا ہے وہ بطن اور فرج ہیں۔ اگر انسان اپنے پیٹ اور اپنی شرم گاہ کے تقاضوں کو بے لگام نہ ہونے دے تو وہ بیش تر برائیوں سے محفوظ رہتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

”جو شخص ان چیزوں کے بارے میں مجھے ضمانت دے سکے جو اس کے دونوں گالوں اور دونوں ٹانگوں کے درمیان ہیں، میں اس کے لیے جنت کا ضامن بنتا ہوں۔“ (متفق علیہ)

روزے کے دوران میں کھانے پینے پر پابندی ہوتی ہے۔ فضول گفتگو سے پرہیز بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس وجہ سے زبان کے چٹخارے اور اس کی فتنہ انگیزیاں بند ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح انسان کی حیوانی ضروریات پر بھی ایک لمبے وقت کے لیے پابندی لگ جاتی ہے۔ چنانچہ اس دوران میں بے راہ روی سے بچے رہنے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی نہ ہونے کی صورت میں روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص شادی کرنے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ نکاح کرے اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو، وہ روزہ رکھے۔“ (بخاری، رقم ۱۷۸۷)

حسن کلام

وہی کلام اچھا اور موثر ہوتا ہے جو شایستہ ہو، حیا کا آئینہ دار ہو اور جھوٹ سے پاک ہو۔ روزے کا زیادہ وقت کم گوئی اور پروردگار کے ساتھ مناجات میں گزرنا چاہیے، لیکن اگر گفتگو کا موقع بھی ہو تو اسے پاکیزہ ہونا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کے دوران میں فحش گفتگو کرنے اور جھگڑنے سے منع فرمایا ہے:

”روزہ دار کو چاہیے کہ وہ روزے میں فحش باتیں نہ کرے، نہ بدتمیزی کرے، اگر کوئی شخص اس سے جھگڑے تو اسے کہہ دے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کہ میں روزے سے ہوں۔'' (بخاری، رقم ۱۷۸۶)

اسی طرح آپ کا ارشاد ہے:

''جو شخص (روزہ رکھ کر) جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔'' (بخاری، رقم ۱۷۸۵)

صبر و برداشت

روزے کی حالت میں روزہ دار صبر و برداشت کا پیکر بن جاتا ہے۔ جب اس کے سامنے کھانا آتا ہے تو بھوک کے باوجود وہ اس سے منہ پھیر لیتا ہے۔ جب کوئی اس سے جھگڑا کرتا ہے تو وہ یہ کہہ کر گریز کر لیتا ہے کہ میں روزے سے ہوں۔

اللہ کے حکم کی پیروی میں انسان کے اس صبر و ثبات پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ ام عمارہ بنت کعب بیان کرتی ہیں:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تشریف لائے تو انھوں نے آپ کے لیے کھانا منگوایا۔ کھانا آیا تو آپ نے فرمایا کہ تم بھی کھاؤ تو انھوں نے کہا کہ میں روزے سے ہوں۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس وقت روزہ دار کے پاس کھانا کھایا جائے، تو فرشتے اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ کھانے سے فارغ ہو جائے۔''

(مشکوٰۃ، رقم ۱۹۸۱)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

روزہ انسان کی ایسی تربیت کر دیتا ہے کہ وہ بڑی سے بڑی آزمایش کو بھی خندہ پیشانی سے سہ لیتا ہے۔ تربیت کے اسی پہلو کی وضاحت میں مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہی روزہ ہے جو مذہب نے انسانوں کی ظاہری و باطنی تربیت کے لیے تجویز فرمایا ہے اور مقصود اس سے ان کی صلاحیت کار کو ضعیف کرنا نہیں ہے، بلکہ اس صلاحیت کار کو صبر اور تقویٰ کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ مستحکم کر دینا ہے تاکہ انسان حق کی مخالف طاقتوں کے مقابل میں، خواہ یہ طاقتیں شیطانی ہوں یا انسانی، جہاد کا اہل ہو سکے۔ قرآن اور حدیث پر نگاہ رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ روزے کے بنیادی مقصد دو بیان کیے گئے ہیں۔ تقویٰ اور صبر۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی زندگی کے ہر مرحلہ میں اور ہر قسم کے حالات میں اپنے نفس کو حدود الٰہی کا پابند رکھے۔ صبر یہ ہے کہ اس راہ میں خارج سے یا اس کے باطن سے جو مشکلات و موانع بھی سر اٹھائیں۔ ان کا پورے عزم و جزم کے ساتھ مقابلہ کرے اور ان کے آگے سپر انداز نہ ہو۔ یہ جہاد زندگی بھر کا جہاد ہے۔ رمضان کے مہینے میں ہر مسلمان اسی جہاد کی ٹریننگ حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ اس کا امکان ہے کہ نئے نئے بھرتی ہونے والوں پر اس ٹریننگ کا فوری اثر اضمحلال اور ضعف کی شکل میں ظاہر ہوتا ہو، لیکن دیکھنے کی چیز یہ فوری اثر نہیں، بلکہ اس کا مستقل اثر ہے۔ اس کا مستقل اثر یقیناً، اس کو صحیح طور پر برتنے کی شکل میں، یہی ہونا چاہیے کہ انسان کی بلادت کم ہو، اس کی روح قوی ہو، اس کا دل توانا ہو، اس کی قوتِ ارادی مضبوط ہو، اس کی قوت برداشت بڑھ جائے، وہ جہاد زندگانی اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے پوری طرح تیار ہو جائے۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۴۶۲)

اللہ سے تعلق

روح انسانی کی فطرت رجوع الی اللہ ہے، مگر نفس کی خواہشات اور شہوات اس کی فطرت کو مجروح کرتی رہتی ہیں۔ روزہ نفس کے میلانات پر پابندی عائد کر کے روح کو اس کے فطری رجحان کے مطابق پروان چڑھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بندہ دنیا سے کٹ کر اللہ کی رضا جوئی کے لیے سرگرم عمل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزے کی عبادت اللہ تعالیٰ کی محبوب ترین عبادت ہے اور اللہ نے اس کا خاص اجر بیان فرمایا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

> ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آدمی کا ہر نیک عمل اس کے کام کا ہے، مگر روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ قسم اس کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی بو سے بہتر ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی روزہ افطار کرتے ہوئے حاصل ہوتی ہے اور دوسری خوشی اس وقت حاصل ہوگی جب وہ اپنے مالک سے ملے گا اور روزے کا اجر دیکھ کر خوش ہوگا۔'' (بخاری، رقم ۱۷۸۶)

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ریحان احمد یوسفی

رمضان کا مہینا ـــــ حاصل کیا کرنا ہے؟

رمضان قمری تقویم کا نواں مہینا ہے۔ یہ مہینا مسلمانوں ہی کے لیے نہیں، انسانوں کے لیے بھی بہت اہم ہے۔ یہ وہ مہینا ہے جب گمراہی کے صحرا میں بھٹکتی انسانیت کی صداے العطش آسمان نے سنی اور باران ہدایت کو عرب کے بیابانوں پر برسنے کا حکم دیا۔ پھر اس سرزمین سے ہدایت کے وہ چشمے ابلے جن سے پوری انسانیت سیراب ہوگئی۔ یہ وہ مہینا ہے جب ظلم کی چکی میں پستی اور سسکتی ہوئی انسانیت کی صداے العدل کا جواب کائنات کے بادشاہ نے عدل سے نہیں، احسان سے دیا اس طرح کہ قیامت تک کے لیے قرآن کو وہ فرقان بنا کر زمین پر اتارا کہ جس کی ہدایت نے دھرتی کو امن وسکون سے بھر دیا۔

ماہ رمضان ایک دفعہ پھر اہل زمین کے سروں پر سایہ فگن ہونے کو ہے۔ اس حال میں کہ آج ہر طرف ظلم اور گمراہی کا دور دورہ ہے۔ انسانیت کے مصائب کا علاج آج بھی یہی ہے کہ قرآن کی ہدایت لوگوں کے سامنے رکھی جائے اور لوگ اسے قبول کر لیں۔ سو خیال وخامہ اسی خدمت کے لیے یکجا ہوتے ہیں۔

صاحب توحید نے قرآن اور رمضان کا تعلق اس طرح بیان کیا ہے:

> ''رمضان کا مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، لوگوں کے لیے رہنما بنا کر اور نہایت واضح دلیلوں کی صورت میں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے سراسر ہدایت بھی ہیں اور حق و باطل کا فیصلہ بھی۔'' (البقرہ ۲: ۱۸۵)

قرآن کی ہدایت کیا ہے؟ اگر اسے ایک جملے میں بیان کیا جائے تو یہ انسانوں کو اس مسئلے سے آگاہ کرنے آیا ہے جو انھیں ان کی موت کے بعد درپیش ہوگا۔ یعنی ان کے مالک کے حضور پیشی کا مسئلہ، اپنے اعمال کی جواب دہی کا مسئلہ، جنت سے محرومی اور جہنم کی آگ کا مسئلہ، ابدی ذلت یا دائمی عیش کا مسئلہ، مگر بڑی عجیب بات ہے کہ یہ ہدایت جس کا تعلق دنیا سے نہیں آخرت سے ہے، زندگی سے نہیں موت سے ہے، انسانوں کی زندگی اور ان کی دنیا کے سارے مسائل کا واحد ممکنہ حل ہے۔

اس دنیا میں انسان کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ یہ کہ وہ ایک فانی دنیا میں ابدی قیام کے اسباب ڈھونڈتا ہے، یہ کہ وہ ایک سرائے

میں رہ کر کسی دائمی مستقر کے آرام ڈھونڈتا ہے۔ اقبال نے جو بات فرنگ کے لیے کہی تھی، وہ ہر فرزند زمین کے بارے میں درست ہے:

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام وائے تمنائے خام

اس عیش اور آرام کی تلاش میں انسان خدا و آخرت کو بھول جاتا ہے۔ وہ فانی دنیا کو اپنا مقصد بناتا اور ہر اخلاقی قدر کو فراموش کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان نوع انساں کا شکاری بن جاتا ہے۔ پھر ظلم اور گمراہی کی وہ ساری اقسام وجود میں آتی ہیں جن سے بحر و بر میں فساد پھیل جاتا ہے۔ انسانوں کی جان، مال، عزت و آبرو انھی جیسے انسانوں کے ہاتھوں پامال ہوتی ہے۔ انسان کا اخلاقی وجود اس کی حیوانی خواہشات کے سامنے ڈھیر ہو جاتا ہے۔

اس صورت حال کا واحد حل وہ قرآنی ہدایت ہے جو پوری قوت کے ساتھ قیامت کے ہول ناک زلزلے سے انسانوں کو ڈراتی ہے۔ وہ اس روز سے انسانوں کو خبر دار کرتی ہے جب زمین کوٹ کوٹ کر برابر کر دی جائے گی اور حسن و زینت کے تمام آثار مٹا کر زمین ایک چٹیل میدان بنا دی جائے گی۔ وہ دن کہ جب لوگ اپنے سوا ہر چیز کو بھول جائیں گے:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔ بے شک قیامت کی ہلچل بڑی ہی ہول ناک چیز ہے۔ جس دن تم اسے دیکھو گے، اس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور ہر حاملہ اپنا حمل ڈال دے گی اور تم لوگوں کو مدہوش دیکھو گے، حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب ہے ہی بڑی ہول ناک چیز۔'' (الحج ۲۲: ۱۔۲)

جو لوگ قرآن کی اس پکار پر توجہ دیتے ہیں اور آخرت کی کامیابی کو اپنی منزل بنا لیتے ہیں، قرآن ان کے سامنے ایک واضح نصب العین رکھتا ہے۔ فرمایا:

''بے شک فلاح پا گیا وہ شخص جس نے پاکیزگی اختیار کی''۔ (الاعلیٰ ۸۷: ۱۴)

''اور نفس گواہی دیتا ہے اور جیسا اسے سنوارا۔ پھر اس کی نیکی اور بدی اسے سجھا دی کہ فلاح پا گیا وہ، جس نے اس کو پاک کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اسے آلودہ کیا۔'' (الشمس ۹۱: ۶۔۱۰)

یہ آیات کھول کر بتاتی ہیں کہ آخرت کی کامیابی کا تمام تر انحصار اس بات پر ہے کہ انسان اس دنیا میں اپنا تزکیہ کرتا ہے یا نہیں۔ یہ تزکیہ رہبانیت جیسی کوئی چیز نہیں، بلکہ ایمان و اخلاق کی آلایشوں سے خود کو بچانے کا عمل ہے۔ ان آیات سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ نفس انسانی میں خیر و شر کا پورا شعور شروع دن ہی سے موجود ہے اور اسی علم کی بنیاد پر انسان یہ جانتا ہے کہ اسے اپنے آپ کو کن آلایشوں سے بچانا اور کن چیزوں کو اختیار کرنا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں انسان اخلاق سے عاری نہیں، بلکہ فطرت کا عطا کردہ پاکیزہ لباس پہن کر آتا ہے۔ اس لباس فطرت کے دامن میں شرک کا کوئی داغ اور الحاد کا کوئی دھبا تک نہیں ہوتا۔ اس پر ظلم کی میل اور ہوس کی گندگی نہیں لگی ہوتی، مگر

دنیا میں موجود شیطانی ترغیبات، حیوانی خواہشات اور ماحول کے اثرات انسان کو گمراہی کے راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔ وہ فطرت میں موجود خیر وشر کے تصورات کو بھول کر خواہش نفس کی پیروی اختیار کرتا ہے۔ جیسے جیسے وہ اس راہ پر آگے بڑھتا ہے، یہ گرد آلود راستہ دامن دل اور لباس فطرت کو غلیظ سے غلیظ تر کرتا چلا جاتا ہے۔ غفلت کی دھول اور سرکشی کی کالک فطرت کے حسن کو نری غلاظت میں بدل دیتی ہے۔ انسان پہلے پہل خیر وشر کی تمیز کھوتا ہے اور پھر معاشرے میں ہر شر خیر اور ہر خیر شر بن جاتا ہے۔ فطرت میں پیدا ہو جانے والی اس کجی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں پیغمبر بھیجے، کتابیں اتاریں، بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اتارا۔ قرآن نہ صرف تزکیہ کے نصب العین کو انسانوں کے سامنے رکھتا ہے، بلکہ ایمان واخلاق اور فکر وعمل کی آلایشوں کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔

قرآن کی اس ہدایت کی روشنی میں ہر بندۂ مومن کی زندگی کا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو فطرت میں موجود اور قرآن میں بیان کردہ ان آلایشوں سے بچائے۔ انسان جیسے ہی یہ عمل شروع کرتا ہے، اس کا براہ راست نتیجہ اس کے اخلاقی وجود پر مرتب ہوتا ہے۔ شرک والحاد کی گندگی کو دھونے کے بعد انسان اپنے جیسے انسانوں کو خدا بناتا ہے نہ خواہش نفس کو اپنا معبود ٹھیراتا ہے۔ آخرت کی کامیابی کا نصب العین تقاضا کرتا ہے کہ انسان کی جان، مال، وقت اور صلاحیت کا ایک حصہ لازماً ذاتی مفادات سے بلند ہو کر صرف کیا جائے۔ ایسے پاکیزہ لوگوں کے معاشرے میں نہ طاقت ور کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں اور نہ اہل ثروت غربا سے بے نیاز اپنی مستیوں میں مگن رہتے ہیں۔ انسان اپنے ابنائے نوع کے ساتھ اس یقین کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں کہ کل روز قیامت ہر معاملہ رب العالمین کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ وہ عدالت جہاں فیصلے مادی نہیں، بلکہ اخلاقی قانون کی بنیاد پر ہوں گے۔ چنانچہ دھوکا، فریب، بددیانتی، خیانت اور جھوٹ اور معاشرے میں پائی جانے والی ان جیسی تمام اخلاقی گندگیاں اوصاف حمیدہ کے لیے جگہ چھوڑ دیتی ہیں۔ یوں دھرتی نور ایمان سے چمک اٹھتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فلاح آخرت اور اس کے لیے پاکیزگی کے حصول پر انسان کو متحرک کرنے والی سب سے بڑی چیز خدا کے حضور پیشی کا خوف، اس کی پکڑ کا اندیشہ، اس کے عذاب کا ڈر اور اس کا تقویٰ ہے۔ یہ تقویٰ ہی وہ چیز ہے جو روزوں کی فرضیت کا سبب ہے۔ ارشاد ہوا:

''ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم اللہ سے ڈرنے والے بن جاؤ۔''

(البقرہ ۲: ۱۸۳)

یہ تقویٰ کیسے پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح کہ رمضان میں قرآن کی بار بار تلاوت انسان کو جہنم کے عذاب اور خدا کی پکڑ سے بے خوف نہیں رہنے دیتی۔ دوسری طرف روزے میں کھانے پینے سے رکنا انسان کو نہ صرف پرہیز گاری کے آداب سکھاتا ہے، بلکہ اسے اس مضبوط قوت ارادی سے آگاہ کرتا ہے جسے استعمال کر کے وہ ہر اخلاقی ناپاکی سے بچ سکتا ہے۔

سو اب جبکہ رمضان کی آمد آمد ہے، آیئے ـــــ رمضان کے استقبال کا عزم کرتے ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں

قرآن صرف ثواب کے لیے پڑھا جاتا ہے، آیئے ـــــ قرآن کو ہدایت کے لیے پڑھنے کا عزم کرتے ہیں۔ یہ عزم کہ قرآن کو سمجھ کر پڑھیں گے۔ یہ جاننے کے لیے پڑھیں گے کہ قرآن جس دن کی مصیبت سے خبردار کرنے آیا ہے، وہ کون سا دن ہے۔ فکر و عمل اور اخلاق و عقیدہ کی ان گندگیوں کو جاننے کے لیے پڑھیں گے جن سے بچے بغیر جہنم کی آگ سے نہیں بچا جا سکتا ہے۔

رمضان ثواب کا مہینا ہے۔ آیئے ـــــ اسے ہدایت کا مہینا بنا دیں۔ یہ بھوک پیاس سے رکنے کا مہینا ہے۔ آیئے ـــــ اسے تقویٰ حاصل کرنے کا مہینا بنا دیں۔ یہ قمری تقویم کا نواں مہینا ہے۔ آیئے ـــــ اسے ایمانی تقویم کا پہلا مہینا بنا دیں۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۹)

(گزشتہ سے پیوستہ)

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ، قَالَ: رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً، اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ، اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى، مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ، وَ سَيِّدًا

یہی موقع تھا کہ زکریا نے اپنے رب کو پکارا۔ اُس نے دعا کی کہ پروردگار، تو مجھے بھی اپنی جناب سے (ایسی ہی) پاکیزہ اولاد عطا فرما۔ یقیناً تو (اپنے بندوں کی) دعائیں سننے والا ہے[۷۳]۔ اِس کے جواب میں فرشتوں[۷۴] نے ندا دی، جب کہ وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا[۷۵] کہ اللہ تجھے یحییٰ[۷۶] کی خوش خبری دیتا ہے جو

[۷۳] سیدہ مریم کو جو حکمت و معرفت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی تھی، اسے دیکھ کر زکریا اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان کے اندر بھی یہ آرزو بھڑک اٹھی کہ کاش ایسا ہی کوئی نیک اور صالح فرزند اللہ تعالیٰ انھیں بھی عطا فرمائے۔

[۷۴] یہ لفظ جمع اس لیے آیا ہے کہ کوئی متعین فرشتہ حضرت زکریا کے پاس نہیں آیا، بلکہ ایک غیبی آواز تھی جو انھیں سنائی دی۔ چنانچہ اس سے مقصود محض اس آواز کی نوعیت بیان کرنا ہے کہ وہ ایک ملکوتی آواز تھی۔ یہ بیان کرنا مقصود نہیں ہے کہ یہ ایک یا ایک سے زیادہ فرشتوں کی آواز تھی۔

[۷۵] اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ فرشتوں سے قرب و اتصال اور اپنے پروردگار سے راز و نیاز اور دعا و مناجات کے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ: رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ

اللہ کے ایک فرمان کی تصدیق کرنے والا [77]، سردار [78] اور دنیا کی لذتوں سے کنارہ کش [79] اور صالحین میں سے ایک

لیے سب سے زیادہ موزوں وقت نماز ہی کا ہے۔

[۷۶] یہ وہی یحییٰ پیغمبر ہیں جن کا نام بائیبل میں یوحنا آیا ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام سے یہ صرف ۶ ماہ پہلے پیدا ہوئے تھے۔

[۷۷] اصل میں 'مصدقا بكلمة من اللّٰه' کے الفاظ آئے ہیں۔ اسی سورہ کی آیت ۴۵ میں آگے قرآن نے صراحت کر دی ہے کہ اس سے مراد سیدنا مسیح علیہ السلام ہیں۔ انھیں 'كلمة من اللّٰه' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ولادت عام ضابطۂ اسباب کے خلاف براہ راست اللہ تعالیٰ کے کلمۂ 'کن' سے ہوئی تھی۔ نصاریٰ نے اسی سے سیدنا مسیح علیہ السلام کی الوہیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، دراں حالیکہ یہ ان کے دعوے کی تردید ہے۔ چنانچہ لفظ 'كلمة' کی تنکیر سے قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بے شمار کلمات میں سے حضرت مسیح بھی ایک کلمہ تھے۔ جس طرح اس عالم رنگ و بو کی ان گنت چیزیں محض کلمۂ 'کن' سے پیدا ہوئی ہیں، اسی طرح وہ بھی اسی کلمہ سے پیدا ہوئے تھے۔

[۷۸] یہ ان کی شخصیت کا بیان ہے کہ وہ اپنی ذات میں سرداری کی شان رکھنے والے ہوں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''نبی اپنی فطرت، اپنی دعوت اور اپنے مشن کے لحاظ سے سردار ہوتا ہے۔ وہ داعی بن کر لوگوں کو پکارتا، منذر بن کر لوگوں کو جگاتا اور ہادی و مرشد بن کر لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کام کے لیے وہ قدرت کی طرف سے تمام لوازم و اسلحہ سے مسلح ہوتا ہے۔ اس کا سینہ خلق کے لیے شفقت و رأفت سے لبریز ہوتا ہے، اس کے کام میں بے پناہ سطوت و جلالت ہوتی ہے، اس کی آواز اور اس کے انداز میں ہیبت ہوتی ہے، اس کی تابناک پیشانی اس کی عظمت و صداقت کی گواہی دیتی ہے۔ اگرچہ وہ کمل کی پوشاک پہنتا ہو اور جنگلی شہد اور ٹڈیوں پر گزارہ کرتا ہو، لیکن اس کے رعب و دبدبہ سے بادشاہوں پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔ وہ حق کے لیے ان کو بھی اسی طرح سرزنش کرتا ہے، جس طرح دوسروں کو کرتا ہے۔ انجیلوں میں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ، دونوں حضرات کے متعلق آتا ہے کہ وہ با اختیار کی طرح بات کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے کلام میں با اختیاری کی یہ شان ان کی اس منصبی سرداری ہی کا ایک جلوہ تھی۔ اس کی تحویل میں قدرت کی طرف سے ایک گلہ بھی ہوتا ہے جس کی چرواہی اس کے سپرد کی جاتی ہے اور اس بات سے اس کی حیثیت عرفی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ گلے نے اس کی اطاعت کی یا نہیں کی۔ اگر اس نے اپنا فرض ادا کیا تو اس نے سرداری کا حق ادا کر دیا اور یہی اس سے مطلوب ہوتا ہے۔''
>
> (تدبر قرآن ۲/۸۱)

[۷۹] اس کنارہ کشی کی وجہ یہ تھی کہ یحییٰ و مسیح، دونوں بنی اسرائیل پر عذاب سے پہلے آخری اتمام حجت کے لیے آئے تھے۔ وہ اس بستی میں گھر کیا بناتے جو سیلاب کی زد میں تھی اور اس درخت کی بہار کیا دیکھتے جس کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا تھا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بَلَغَنِیَ الْکِبَرُ، وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ، قَالَ : کَذٰلِکَ اللّٰہُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ﴿۴۰﴾
قَالَ: رَبِّ اجْعَلْ لِّیْٓ اٰیَۃً، قَالَ: اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا،
وَاذْکُرْ رَّبَّکَ کَثِیْرًا، وَّسَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْکَارِ﴿۴۱﴾

نبی ہوگا[۸۰]۔ اُس نے تعجب سے پوچھا: پروردگار، میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہوگا، میں تو بوڑھا ہو چکا اور میری بیوی بھی بانجھ ہے؟ فرمایا: اللہ اِسی طرح جو چاہے، کرتا ہے[۸۱]۔ اُس نے عرض کیا: پروردگار، پھر میرے لیے کوئی نشانی ٹھیرا دیں[۸۲]۔ فرمایا: تمھارے لیے نشانی یہ ہے کہ تین دن تک تم لوگوں سے اشارے کے سوا کوئی بات نہ کرسکو گے۔ (ہاں، تسبیح وتہلیل، البتہ کرسکو گے، لہٰذا یہ دن اِسی طرح گزارنا) اور (اِس دوران میں) اپنے پروردگار کو بہت یاد کرنا اور صبح وشام اس کی تسبیح کرتے رہنا[۸۳]۔ ۳۸۔۴۱

ایک ایک دروازے پر دستک دے کر لوگوں کو آنے والے طوفان سے خبردار کرنے والے اپنا گھر بسانے اور اپنا کھیت اگانے میں لگ جاتے تو اپنے فرض سے کوتاہی کے مرتکب قرار پاتے۔ چنانچہ دونوں نے تجرد وانقطاع کا طریقہ اختیار کیا، قوت لایموت پر اکتفا کی، درویشوں کا لباس پہنا اور زمین و آسمان ہی کو چھت اور بچھونا بنا کر زندگی بسر کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ یہ نصاریٰ کی بدقسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان جلیل القدر پیغمبروں کی اس منصبی ذمہ داری کو سمجھنے کے بجائے انھوں نے اسے رہبانیت کا رنگ دیا اور پھر اسی کو دین کا اصلی مطالبہ قرار دے کر رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ ہمارے ہاں بھی صوفیوں نے پیغمبروں کی زندگی میں اسی طرح کی بعض چیزوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت سے اجنبی تصورات دین میں داخل کر دیے ہیں اور اب گزشتہ کئی صدیوں سے علما کو بھی ان سے متاثر کر لینے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

[۸۰] یعنی ان اوصاف وکمالات کے باوجود وہ زمرۂ صالحین میں سے ایک پیغمبر ہی تھے۔ یہ نہیں کہ انھیں الوہیت کا کوئی مقام حاصل ہو گیا تھا۔

[۸۱] یعنی اسباب تو محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ اصلی چیز اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے۔ وہ چاہے تو دریا کو سراب بنا دے اور چاہے تو صحرا سے حباب اٹھا دے۔ اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

[۸۲] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زکریا کا گمان تو اگرچہ یہی تھا کہ یہ بشارت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، لیکن دل کے کسی گوشے میں یہ کھٹک ضرور تھی کہ ممکن ہے یہ اپنے ہی گنبد دل کی صدا اور اپنی ہی آرزووں کے ہجوم میں شیطان کا کوئی القا ہو جسے وہ فرشتوں کا الہام سمجھ بیٹھے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

[۸۳] یہ چیز، ظاہر ہے کہ شیطانی تصرف کے ہر امکان کو ختم کر دیتی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... کسی شیطانی اثر سے یہ بات پیدا ہوتی تو اس کا نتیجہ اس کے بالکل برعکس ظاہر ہونا تھا، یعنی آدمی اپنی دنیاداری کی باتیں تو کر سکتا، لیکن اللہ اللہ کرنا اس پر شاق گزرتا۔ اگر حضرت زکریا پر یہ حالت غیر اختیاری طور پر طاری کر دی گئی تو یقیناً یہ اس بات کی ایک قطعی نشانی تھی کہ ان کو بیٹے کی جو بشارت ملی ہے، من جانب اللہ ہے، اس میں شیطانی دھوکے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ قرآن نے یہاں ضمناً اس بات کی تردید بھی کر دی جو انجیل لوقا میں بیان ہوئی ہے کہ حضرت زکریا کو جو یہ حالت پیش آئی، وہ ان کے اس جرم کی سزا کے طور پر تھی کہ انھوں نے فرشتے کی بات کا اعتبار نہ کیا اور سوال کر بیٹھے کہ مجھے اس کی کوئی نشانی دی جائے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۸۳)

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

معز امجد/ اظہار احمد

احرام باندھتے وقت خوشبو کا استعمال

روىٰ[1] أن عائشة أم المؤمنين رضى اللّٰه عنها قالت : كنا نخرج مع النبى[2] صلى اللّٰه عليه وسلم إلى مكة فنضمد جباهنا بالسك المطيب عند الإحرام[3]. فإذا عرقت إحدانا سال على وجهها[4]. فيراه النبى صلى اللّٰه عليه وسلم فلا ينهانا[5].

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

روایت ہے کہ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (حج یا عمرہ کے لیے) مکہ جاتیں تو احرام باندھتے ہوئے ایک رومال اپنی پیشانی پر باندھ لیتیں جس پر خوشبو لگی ہوتی[1]۔ ہم میں سے کسی کو پسینہ آتا تو یہ (خوشبو) اس کے چہرے پر پھیل جاتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ (عمل) دیکھا، مگر ہمیں اس سے منع نہیں فرمایا[2]۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنت جاری کی ہے کہ احرام باندھنے کے بعد کوئی خوشبو استعمال نہ کی جائے۔

۲۔ خوشبو لگانے کی یہ ممانعت احرام باندھنے کے بعد ہے۔

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ ابوداؤد کی روایت، رقم ۱۸۳۰ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

بیہقی، رقم ۸۸۳۴۔ احمد بن حنبل، رقم ۲۴۵۴۶، ۲۵۱۰۶۔ ابویعلیٰ، رقم ۴۸۸۶۔

۲۔ احمد بن حنبل، رقم ۲۴۵۴۶ میں 'نخرج مع النبي' (ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہوتیں) کے بجائے 'إنهن كن يخرجن مع رسول الله' (وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہوتیں) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں، جبکہ احمد بن حنبل، رقم ۲۵۱۰۶ میں یہی مضمون 'كن أزواج النبي يخرجن معه' (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج ان کے ہمراہ روانہ ہوتیں) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

۳۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۲۴۵۴۶ میں 'فنضمد جباهنا بالسك المطيب عند الإحرام' (ہم اپنی پیشانیوں پر ایک خوشبو لگی پٹی باندھ لیتیں) کے بجائے 'عليهن الضماد قد أضمدن قبل أن يحرمن' (ان پر احرام سے قبل باندھی ہوئی ایک پٹی ہوتی) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۴۔ بعض روایات مثلاً ابویعلیٰ، رقم ۴۸۸۶ میں 'سال على وجهها' (یہ اس کے چہرے پر بہ جاتی) کے بجائے 'فيسيل على وجوهنا' (تو یہ ہمارے چہروں پر بہتی) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

۵۔ 'ينهانا' (ہمیں روکتے) کے الفاظ بیہقی، رقم ۸۸۳۴ میں نقل ہوئے ہیں، جبکہ ابوداؤد، رقم ۱۸۳۰ میں 'ينهاها' (اسے روکتے) کے الفاظ آئے ہیں۔ بعض روایات مثلاً ابویعلیٰ، رقم ۴۸۸۶ میں 'فلا ينهانا' (تو آپ ہمیں منع نہ کرتے) کے بجائے 'فلا يعيب ذلك علينا' (آپ نے اس بارے میں ہم پر کوئی اعتراض نہ کیا) کے الفاظ، جبکہ احمد بن حنبل، رقم ۲۵۱۰۶ میں 'لا ينهاهن عنه محلات ولا محرمات' (آپ انھیں احرام باندھنے سے قبل منع کرتے اور نہ بعد میں) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

احمد بن حنبل، رقم ۲۴۵۴۶ میں یہی روایت اس طرح بیان ہوئی ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

إنهن كن يخرجن مع رسول الله صلى الله عليه وسلم عليهن الضماد قد أضمدن قبل أن يحرمن ثم يغتسلن وهو عليهن يعرقن ويغتسلن لا ينهاهن عنه.

''وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (مکہ کے لیے) روانہ ہوتیں تو ان کے سر پر احرام سے قبل باندھی ہوئی ایک پٹی ہوتی۔ وہ اسی حال میں غسل کر لیتیں، انھیں پسینہ آتا تو (اسے) دھو لیتیں، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اس سے منع نہیں فرمایا۔''

ابویعلیٰ، رقم ۴۸۸۶ میں سیدہ عائشہ کی یہ روایت مختلف طریقے سے بیان ہوئی ہے:

كنا نخرج مع رسول الله صلى الله عليه وسلم وقد تضمخنا بالزعفران والورس وقد أحرمنا فنعرق فيسيل على وجوهنا فيراه رسول الله صلى الله عليه وسلم فلا يعيب ذلك علينا.	''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (مکہ) جاتیں تو اپنے اوپر احرام کے باوجود زعفران اور ورس لگا لیتیں۔ ہمیں پسینہ آتا تو یہ (خوشبو) ہمارے چہروں پر پھیل جاتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب دیکھا، مگر اس معاملے میں ہم پر کوئی اعتراض نہ کیا۔''

اس روایت میں مذکور یہ بات کہ ازواج مطہرات اپنے اوپر احرام کے باوجود زعفران اور ورس لگا لیتی تھیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جاری کردہ سنت اور مذکورہ بالا روایات کے خلاف ہے۔ چنانچہ، ہمارے نزدیک، اس روایت کے راوی سے بات بیان کرنے میں سہو ہوا ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

ہمارا دین

عـن يـحيـىٰ بـن يعمر قال: كان أول من قال فى القدر بالبصرة معبد الجهنى . فـانـطـلـقت أنا و حميد بن عبدالرحمن الحميرى حاجين أو اعتمرين . فـقـلـنا: لو لقينا أحدا من أصحاب رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سـلم فسألناه عما يقول هؤلاء فى القدر. فوفق لنا عبداللّٰه ابن عمربن الـخـطاب رضى اللّٰه عنهما داخلا المسجد . فـاكتـنفته أنا و صاحبى، أحدنا عن يمينه و الآخر عن شماله . فظننت أن صاحبى سيكل الكلام إلى . فـقـلـت: أبـا عبـد الـرحـمٰـن، إنه قد ظهر قبلنا ناس يقرؤن القرآن و يتـقـفـرون العلم و ذكر من شأنهم و أنهم يزعمون أن لا قدر و أن الأمر أنف. قـال: فـإذا لقيت أولئك فأخبرهم أنى برئ منهم و أنهم براء منى . والـذى يحلف به عبداللّٰه بن عمر لو أن لأحدهم مثل أحد ذهبا فأنفقه مـا قبل اللّٰه منه حتى يؤمن بالقدر ثم قال: حدثنى أبى عمر بن الخطاب قـال: بينما نحن عند رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم ذات يوم. إذ طلع

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

علينا رجل شديد بياض الثياب شديد سواد الشعر . لايرى عليه أثر السفر. ولا يعرفه منا أحد . حتى جلس إلى النبى صلى اللّٰه عليه وسلم. فأسند ركبتيه إلى ركبتيه وضع كفيه على فخذيه. قال: يا محمد أخبرنى عن الإسلام؟ فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: الإسلام أن تشهد أن لا إله إلا اللّٰه وأن محمدا رسول اللّٰه وتقيم الصلوة وتؤتى الزكوة وتصوم رمضان وتحج البيت إن استطعت إليه سبيلا . قال: صدقت . قال: فعجبنا له يسأله ويصدقه . قال: فأخبرنى عن الايمان . قال: أن تومن باللّٰه وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر وتؤمن بالقدر خيره وشره. قال: صدقت . قال: فأخبرنى عن الإحسان. قال: أن تعبد اللّٰه كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك. قال: فأخبرنى عن الساعة. قال: ماالمسؤل بأعلم من السائل. قال: فأخبرنى عن أمارتها. قال: أن تلد الأمة ربتها، وأن ترى الحفاة العراة العالة رعاء الشاء يتطاولون فى البنيان . قال: ثم انطلق، فلبثت مليا. ثم قال لى: يا عمر، أتدرى من السائل؟ قلت: اللّٰه ورسوله أعلم: قال: فأنه جبريل أتاكم يعلمكم دينكم.

''یحییٰ بن یعمر بیان کرتے ہیں کہ بصرہ میں سب سے پہلے معبد جہنی نے تقدیر کے بارے میں کچھ (اختلافی) رائے ظاہر کی تھی۔ (یہی زمانہ تھا کہ) میں اور حمید بن عبدالرحمٰن حج یا عمرے کے لیے نکلے۔ چنانچہ ہم نے سوچ لیا تھا کہ اگر اصحاب رسول میں سے کسی سے ملاقات ہوئی تو ہم اس سے تقدیر کے متعلق یہ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے بارے میں پوچھیں گے۔ اتفاق کی بات ہے کہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہمیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہی مسجد حرام میں داخل ہوتے ہوئے مل گئے۔ چنانچہ ہم نے انھیں اس طرح گھیر لیا[2] کہ ہم میں سے ایک ان کے دائیں اور دوسرا ان کے بائیں طرف تھا۔ میرا گمان تھا کہ میرے ساتھی بات کرنے کی ذمہ داری[3] مجھے ہی دیں گے۔ چنانچہ میں نے کہا: ابوعبدالرحمٰن، معاملہ یہ ہے کہ ہماری طرف کچھ ایسے لوگ سامنے آرہے ہیں جو قرآن کا درس دیتے ہیں اور علم کی گہرائیوں میں اترتے ہیں[4] اور اس طرح ان کے کچھ دوسرے پہلوؤں کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تقدیر کوئی چیز نہیں ہے، ہر معاملہ نیا ہوتا ہے (یعنی پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتا)۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جب تم ان لوگوں سے ملو تو انھیں میری طرف سے بتا دینا کہ میں ان سے بری ہوں اور وہ مجھ سے بری ہیں۔ عبداللہ بن عمر اس ذات کی قسم کھاتا ہے، اگر ان میں سے کسی کے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور وہ اسے خیرات کر دے تو اللہ اسے قبول نہیں کریں گے یہاں تک کہ وہ تقدیر پر ایمان نہ لے آئے۔ پھر کہا: میرے والد، عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مجھے بتایا تھا: ایک[5] روز ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک ایک آدمی نمودار ہوا۔ اس کے کپڑے انتہائی

۱؎ اصل میں 'وفق لنا' ہے۔ یہ 'وفق' سے مجہول ہے۔ اس کا مطلب ہے توفیق دینا، موافق کرنا، عین موقع پر ہونا یا آنا۔ ہم نے آخری معنی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس جملے کے معنی: 'اتفاق کی بات ہے' کیے ہیں۔

۲؎ اصل میں 'اکتنفتہ' ہے۔ 'کنف' کے معنی کنارے یا ناحیہ کے ہیں۔ اس اعتبار سے 'اکتنف' کے ایک معنی ساتھ لگنے کے ہیں۔ اسی طرح یہ لفظ باڑھ لگانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ اس کے ایک معنی احاطہ کرنے کے بھی ہیں۔ سیاق وسباق کی مناسبت سے ہم نے اس کا ترجمہ 'گھیر لیا' کیا ہے۔

۳؎ اصل میں 'سیکل الکلام إلی' ہے۔ 'وکل یکل' کا مطلب ذمہ داری دینا ہے۔ اسی طرح یہ موقع دینے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس روایت کے ایک دوسرے متن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلے معنی میں ہے۔

۴؎ اصل میں 'یتقفرون' ہے۔ 'قفر' اور 'تقفر' پیروی کرنے کے معنی میں آتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد گہرے نکتوں تک پہنچنا ہے۔

۵؎ اصل جملہ 'بینما' سے شروع ہوا ہے۔ اس کی ایک لغت 'بینا' بھی ہے۔ یہ ظرف زمان ہے اور دو جملوں کی طرف مضاف ہوتا ہے۔ دوسرے جملے پر کبھی 'اذ' آتا ہے اور کبھی نہیں۔

سفید اور بال بالکل سیاہ تھے[6]۔ اس پر سفر کی کوئی علامت نظر نہ آتی تھی اور ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا بھی نہ تھا۔ (آگے بڑھتے ہوئے) وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے گھٹنے آپ کے گھٹنوں سے ملا دیے اور اپنے ہاتھ اپنے زانووں پر رکھ لیے اور کہا: اے محمد، مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے۔ آپ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تو اس بات کا برملا اقرار کرے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، نماز کا اہتمام کرے، زکوٰۃ ادا کرے، ماہ رمضان کے روزے رکھے اور اگر زادراہ[7] کی استطاعت ہو تو حج کرے۔ (آپ کا جواب سن کر) اس آدمی نے کہا: آپ نے درست فرمایا ہے۔ اس پر ہم حیران ہوئے کہ (عجیب آدمی ہے) آپ سے سوال بھی کر رہا ہے اور تصدیق بھی کر رہا ہے۔ پھر اس نے پوچھا: مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے۔ آپ نے فرمایا: (ایمان یہ ہے کہ) تو اللہ پر، اس کے فرشتوں پر[8]، اس کی کتابوں پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور تقدیر کے اچھے اور برے پر بھی ایمان رکھے۔ (آپ کا یہ جواب سن کر بھی) اس نے کہا: آپ نے درست فرمایا ہے۔ پھر اس نے پوچھا: مجھے احسان کے بارے میں بتائیے۔ آپ نے فرمایا: (احسان یہ ہے کہ) تو اللہ کی اس طرح عبادت کرے جیسے کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ پھر اگر تم اسے نہیں دیکھ پاتے (تو کیا ہوا) وہ تو تمھیں دیکھ رہا ہے[9]۔ اس نے پوچھا: مجھے قیامت (کا وقت) بتائیے۔ آپ نے فرمایا: جس سے پوچھا گیا ہے وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔ تب اس نے کہا: مجھے اس کی علامات سے آگاہ

۶۔ اصل میں 'شدید بیاض الثیاب شدید سواد الشعر' کے الفاظ ہیں۔ یہ تراکیب 'رجل' کی صفت ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اجنبی ہونے کے باوجود اس پر سفر کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔

۷۔ اصل میں 'سبیلا' ہے۔ یہ تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یہاں اس سے مراد زادراہ ہے۔

۸۔ فرشتوں کے لیے عربی لفظ 'ملائكة' ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق اصل 'مألك' ہے۔ 'الك' کا مطلب پیغام پہنچانا ہے۔ مصدر 'الالوكة' ہے۔ اس سے 'ملئك' بنا۔ جو 'ملاك' اور 'ملك' میں بدلا۔ لیکن جمع میں ہمزہ واپس آ جاتی ہے: 'ملائك' اور 'ملائكة'۔

۹۔ حدیث میں یہ بات 'ان تعبد الله كأنك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك' سے ادا کی گئی ہے۔ 'كأنك تراه' حال یا مصدر کے محل پر ہے۔ 'فان لم تكن تراه' کے 'فانه يراك' جواب شرط نہیں ہے، بلکہ مقدر جواب 'لا بأس' پر عطف ہے۔ ترجمے میں ہم نے 'تو کیا ہوا' کے الفاظ سے قوسین میں اسی مقدر کو کھولا ہے۔

فرمائیے۔ آپ نے فرمایا: یہ کہ لونڈی اپنی آقا کو جنم دے اور یہ کہ تو ان برہنہ پا چلنے والوں[10]، ڈھنگ کا لباس نہ رکھنے والوں[11] اور بکریوں[12] کے چرواہوں[13] کو ایک سے بڑھ کر ایک اونچی عمارتیں تعمیر کرتے ہوئے دیکھے۔ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں: اس کے بعد وہ آدمی چلا گیا۔ میں کچھ دیر رکا رہا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر، جانتے ہو سائل کون تھا۔ میں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ جبریل تھے جو تمھیں تمھارا دین سکھانے آئے تھے۔''

معنی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روایت میں دین کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کو بڑی جامعیت سے بیان کر دیا ہے۔ روایت میں مضمون ظاہری اعمال سے باطنی اعمال اور پھر باطن کی سب سے اعلیٰ حالت احسان کی طرف بڑھتا ہے اور اس کا اختتام علامات قیامت کے تذکرے پر ہوا ہے۔ اس اعتبار سے یہ تذکیر و موعظت کا جامع مجموعہ ہے۔ اس حدیث میں اسلام اور ایمان میں فرق اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کیا گیا ہے کہ جب کوئی فرد اسلام قبول کرتا ہے تو اس کے ظاہری اعمال اور اس کے ایمانیات میں کیا چیزیں ظاہر ہوتی ہیں۔ قرآن مجید میں یہ دونوں مترادف کی حیثیت سے بھی آئے ہیں اور اس طرح ظاہر و باطن کی توضیح کے لیے بھی۔ ایمان و اسلام کے فرق پر قرآن مجید کی درج ذیل آیت دلالت کرتی ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا، قُلْ: لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا: اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ. (الحجرٰت ۴۹: ۱۴)

''اہل بدو نے کہا: ہم ایمان لائے۔ ان کو بتادو کہ تم ایمان نہیں لائے، ہاں یوں کہو کہ ہم نے اطاعت قبول کی اور ایمان ابھی تک تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں کو ایمانیات کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہ اسی طرح بیان ہوئی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں اللہ پر ایمان کی ایک فرع تقدیر کا ذکر ہوا ہے، جبکہ قرآن مجید کی اس آیت میں یہ پہلو مذکور نہیں ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۱۰؎ عربی کا لفظ 'الحفاة' ہے۔ ننگے پاؤں 'الحافی' کی جمع ہے۔ اس پر الف لام عہد کا ہے۔ مراد عرب کے چرواہے ہیں۔

۱۱؎ اصل میں 'العراة' ہے۔ مراد ہے بے لباس لوگ، یہ 'العاری' کی جمع ہے۔ اس پر بھی الف لام عہد کا ہے۔ یہ انھی چرواہوں کی ایک دوسری نشانی ہے۔ یعنی یہ آج ڈھنگ کے لباس سے بھی محروم ہیں۔

۱۲؎ حدیث میں بکریوں کے لیے 'الشاء' کا لفظ آیا ہے۔ یہ بھی جمع ہے اور اس کا واحد 'شاة' ہے۔

۱۳؎ اصل میں 'رعاء' ہے۔ مراد ہے: چرواہے، یہ 'الراعی' کی جمع ہے۔

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ. (۲:۲۸۵)

’’ہر ایک ایمان لایا اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔‘‘

اس روایت میں اسلام کے تحت جو اعمال بیان ہوئے ہیں ان کا ذکر قرآن مجید میں یکجا نہیں ہے، لیکن یہ وہ اعمال ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں بڑے اہتمام سے ہوا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ ان کی حیثیت لازمی اعمال کی ہے۔ ہم یہاں ان سے متعلق آیات نقل نہیں کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے آگے ان کے متعلق الگ الگ عنوانات کے تحت احادیث جمع کی ہیں۔ ان سے متعلق آیات بھی وہیں نقل کرنا زیادہ موزوں ہوگا۔

احسان کی اصطلاح قرآن مجید سے ماخوذ ہے۔ خود قرآن مجید میں اس کی حقیقت سورۂ نساء میں بیان کی گئی ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ. (۴:۱۲۵)

’’باعتبار دین اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے، جس نے اپنا چہرا خدا کے لیے برائے تسلیم خم کر لیا اور وہ خوب کار بھی ہو۔‘‘

یعنی دین میں احسان یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کے حوالے کر دے۔ وہ اس کے ہر حکم کو بجا لائے اور تعمیل حکم اس طرح کرے جس طرح سے اس کا حق ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل کے سوال کے جواب میں اسی احسان کو پانے کا طریقہ بتایا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ جب تم اللہ کے کسی حکم کی تعمیل کر رہے ہو تو یہ خیال کرو کہ اللہ تمھیں دیکھ رہا ہے، لیکن اس بات کو بیان کرنے کے لیے آپ نے بلیغ اسلوب اختیار کیا ہے۔ آپ نے پہلے یہ کہا کہ تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اس میں اگرچہ ’گویا کہ‘ کے لفظ سے یہ واضح تھا کہ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کو دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے خود ہی بیان کر دیا کہ اگرچہ تم اسے نہیں دیکھ سکتے، لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے تم یہ خیال کرو کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا تصور اتنا قوی تاثر رکھتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو خدا کے سامنے محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو ایک مومن کے عمل سے کوتاہی اور کمی کو دور کرنے میں اس کی مدد کرتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ایک مومن کی نیت اور محرکات کو درست کر کے اس کو اخلاص کی نعمت سے مالا مال کرتی ہے۔ احسان اس کے سوا کچھ نہیں کہ عمل بھی درست ہو اور نیت بھی صالح ہو۔ قرآن مجید میں بھی یہ بات بیان ہوئی ہے، لیکن اس میں اسلوب بیان مختلف ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں تقریباً تمام احکام میں اللہ تعالیٰ کے سمیع و بصیر اور علیم و محیط ہونے کے پہلو کو بیان کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے اس بیان کے عملی پہلو کو واضح کیا ہے۔

علامات قیامت کے باب میں یہ روایت جن دو بنیادی نشانیوں کو بیان کرتی ہے۔ ان کے بارے میں بنیادی بات یہ واضح رہنی چاہیے کہ یہ سرزمین عرب سے متعلق ہیں۔ اس کا واضح قرینہ عہد کا الف لام ہے۔ یعنی ’الحفاة‘ اور ’العراة‘ پر لام عہد ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے عرب چرواہوں کی صفات ہیں۔ سرزمین عرب کے یہی غریب قبائل ہیں، جن کی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نسلیں آج غیر معمولی دولت مند ہیں۔ وہ جنھیں سر چھپانے کے لیے چھت میسر نہ تھی، آج محلات میں رہ رہے ہیں۔ یہ نشانی اپنے تمام مظاہر کے ساتھ تمام ہو چکی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں ان کے لیے عمارتوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ ملوک الارض کی تعبیر بھی بیان ہوئی ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ اس زمانے کے وہ قبائل جو بھیڑ بکریاں چراتے تھے اور یہی ان کی معیشت کا بڑا ذریعہ تھا آج عرب کے بادشاہ ہیں۔

دوسری نشانی غلامی سے متعلق ہے۔ لونڈی کا اپنی آقا کو جنم دینا اپنے مصداق کے تعین کے اعتبار سے ایک مشکل نشانی ہے۔ شارحین نے ان الفاظ سے اقدار کی تباہی، اسلامی اقدار کی ترقی (یعنی لونڈی کی اولاد کو مراتب حاصل ہوں گے) اور اولاد کی نافرمانی کے معنی متعین کیے ہیں۔ موجودہ دور میں بعض اہل علم نے اس کا اطلاق کرائے کی ماں کی اولاد (ٹیسٹ ٹیوب بے بی) پر کیا ہے۔ اس نشانی کے الفاظ سے اس تاویل کی کوئی مناسبت نہیں ہے۔ البتہ اس کا کیا کیا جائے کہ ان الفاظ سے دوسرے شارحین نے جو نشانی سمجھی ہے اس کی مناسبت بھی الفاظ کے ساتھ ایسی ہی ہے۔ استاذ محترم جناب جاوید احمد غامدی کی رائے یہ ہے کہ جس طرح چرواہوں سے متعلق نشانی بھی سرزمین عرب سے متعلق ہے اسی طرح یہ نشانی بھی سرزمین عرب سے متعلق ہے۔ قرب قیامت میں غلامی کے معاملے میں سب سے بڑا واقعہ یہ ہوا ہے کہ اسے ختم کر دیا گیا ہے۔ پوری دنیا کے ساتھ ساتھ عرب میں بھی غلامی ختم کر دی گئی تھی۔ ایک رات پہلے جو غلام تھا وہ اب آزاد تھا۔ اپنے آقا کے برابر کی حیثیت کا شہری۔ استاذ محترم کے نزدیک اس جملے میں ولادت کا فعل توسعاً استعمال ہوا ہے۔ یعنی ایک نسل ایک دن پہلے تک غلام تھی اور غلام ہی پیدا کر رہی تھی، لیکن اب وہ آزاد ہے اور آزادوں ہی کو جنم دے رہی ہے۔ اسی طرح وہ 'ربتھا' کی ترکیب کو بھی دوسرے طریقے سے کھولتے ہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ یہ اضافت 'ام علی قلوب أقفالها' (محمد ۴۷: ۲۴) کے اسلوب پر ہے۔ جس طرح یہاں اس سے دلوں کے تالے مراد ہے، اسی طرح روایت میں لونڈیوں کے آقا یعنی آزاد مراد ہیں۔

عرب کی سرزمین میں موجودہ زمانے میں غلامی کا خاتمہ، عربوں کے لیے دولت کی فراوانی اور چرواہوں کے بادشاہ بننے کے واقعات کا ایک ہی زمانے میں ظہور اور زیر بحث جملے کی یہ تالیف اس جملے کی غلامی کے خاتمے سے تعلق کو بہت قوی بنا دیتی ہے۔

متون

اس روایت کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ یحییٰ بن یعمر کی حضرت ابن عمر سے ملاقات کے پس منظر کو بیان کرتا ہے۔ یہ حصہ مسلم کے علاوہ ہمیں ابن مندہ کی کتاب الایمان میں بھی ملتا ہے۔ ابن مندہ کا بیان ذرا تفصیلی ہے:

عن یحییٰ بن یعمر قال: رجل من جهینة   ''یحییٰ بن یعمر بیان کرتے ہیں کہ جہینہ کا ایک آدمی جس

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

فيه زهو وكان يتوثب على جيرانه . ثم إنه قرأ القرآن وفرض الفرائض وقص على الناس ثم إنه صار من أمره أنه زعم أن العلم أنف . من شاء عمل خيرا ومن شاء عمل شرا . قال: فلقيت أبا الأسود الدبلى . فذكرت ذلك له . فقال: كذب، مارأينا أحدا من أصحاب رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم إلا يثبت القدر . ثم إنى حججت أنا وحميد بن عبدالرحمن الحميرى . فلما حجنا . قال: قلنا نأتى المدينة فنلقى أصحاب رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم. فنسألهم عن القدر. قال: فلما أتيت المدينة لقينا إنسانا من الأنصار. فلم نسأله . قلنا حتى نلقى ابن عمر وأبا سعيد الخدرى. قال: فلقينا ابن عمر كفه عن كفه.قال: فقمت عن يمينه وقام عن شماله. قال: قلت تسأله أم أسأله . قال: لا بل تسأله . لأنى كنت أبسط لسانا منه . قال: قلنا يا أبا عبد الرحمن، إن ناسا عندنا بالعراق قد قرؤوا القرآن وفرضوا الفرائض وقصوا على الناس يزعمون أن العمل أنف. من شاء عمل خيرا ومن شاء عمل شرا . قال: فإذا لقيتم أولئك. فقولوا: يقول ابن عمر هو منكم برئ وأنتم منه براه ، ابن عمر

میں کچھ تکبر تھا، اپنے ہمسائیوں کے ساتھ زیادتی بھی کرتا تھا، اس کے ساتھ ساتھ قرآن بھی پڑھتا تھا اور فرائض ادا کرتا تھا۔ لوگوں کے سامنے (اپنے خیالات) بیان کرتا تھا۔ پھر اس کا معاملہ یہ ہو گیا کہ اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ (ہر چیز) علم (الٰہی) میں نئے سرے سے آتی ہے۔ جو چاہے خیر کرے، جو چاہے برا کرے۔ چنانچہ میں ابو اسود سے ملا اور انھیں یہ ساری بات بتائی۔ انھوں نے کہا: اس نے غلط کہا۔ ہم نے کسی صحابی کو نہیں دیکھا، مگر یہ کہ تقدیر کو ثابت کرتے تھے۔ اس زمانے میں میں نے اور حمید بن عبدالرحمان حمیری نے حج کیا۔ جب ہم نے حج کر لیا تو ہم نے سوچا کہ ہم مدینہ چلتے ہیں وہاں صحابہ سے ملاقات کریں گے اور ان سے تقدیر کے بارے میں پوچھیں گے۔ جب ہم مدینہ آئے تو ہماری ملاقات ایک انصاری سے ہوئی، لیکن ہم نے ان سے نہیں پوچھا۔ یہاں تک کہ ہماری ملاقات ابن عمر اور ابوسعید خدری سے ہوئی۔ چنانچہ ہماری ابن عمر سے ملاقات میں آمنا سامنا ہوا تو میں ان کے دائیں طرف اور وہ ان کے بائیں طرف کھڑا ہو گیا۔ میں نے پوچھا: میں پوچھوں یا تم پوچھو گے۔ اس نے کہا: نہیں، بلکہ، تم ہی پوچھو، کیونکہ میں زیادہ واضح بات کرنے والا تھا۔ ہم نے کہا: ابو عبدالرحمٰن، ہمارے ہاں عراق میں کچھ لوگ ہیں۔ انھوں نے قرآن پڑھا ہے۔ فرائض ادا کیے ہیں۔ لوگوں کے سامنے دعوے کے انداز میں کہتے ہیں کہ عمل نیا ہوتا ہے۔ جو چاہے اچھا کرے اور جو چاہے برا کرے۔ ابن عمر نے کہا: جب ان لوگوں سے ملاقات ہو تو کہنا: ابن عمر کہتا ہے: وہ تم سے بری

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

منكم بريئ و أنتم منه براء . فو الله لو جاء احدهم من العمل مثل أحد ما تقبل من حتى يؤمن بالقدر. (رقم۱۱)

ہے اورتم اس سے بری ہو۔ ابن عمرتم سے بری ہے اورتم اس سے بری ہو۔ بخدا اگر یہ احد پہاڑ کے برابر بھی عمل کرتے تو اللہ ان سے یہ عمل قبول نہ کرتا، یہاں تک کہ یہ تقدیر پر ایمان لے آئیں۔''

مسلم کی روایت کی تمہید اور اس روایت میں تفصیل اور اجمال کا فرق ہے۔ اس سے معبد جہنی کے کردار پر کچھ روشنی پڑتی ہے اور اس کے افکار کے بارے میں بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس مخمصے کا شکار تھا، بظاہر روایت کے دونوں متون میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے اندازہ ہو کہ اس بحث کے آغاز کے اسباب کیا تھے، لیکن عراق کی تصریح یہ اندازہ کرنے میں مدد دیتی ہے کہ یہ بحث ایرانی طرز فکر کے اثرات کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ اور معبد جہنی کے طرز استدلال میں فرق بہت نمایاں ہے۔ مزید برآں جس بحث کو اس واقعے میں بڑے تعجب سے دیکھا جا رہا ہے بعد میں یہی بحث بڑے زور وشور سے ہوئی اور اس کی بنا پر کئی فرقے وجود میں آئے۔

روایت کا دوسرا حصہ حضرت جبریل علیہ السلام کے سوال و جواب پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ ایک الگ روایت کی حیثیت سے حضرت عمر کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔ ان متون کے الفاظ باہم دگر بہت مختلف ہیں۔ ہم یہاں خوف طوالت کے پیش نظر صرف اہم اختلافات ہی کا ذکر کریں گے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت کے آغاز میں اس مکالمے کے زمانے کے بارے میں تصریح ہے۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ یہ مکالمہ اس وقت پیش آیا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹھنے کے لیے مسجد نبوی میں چبوترہ بنا دیا گیا تھا۔ نسائی میں ہے:

عن ابی هريره و ابی ذر قالا: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يجلس بين ظهراني أصحابه. فيجيء الغريب، فلا يدرى ايهم هو حتى يسأل . فطلبنا إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن نجعل له مجلسا يعرفه الغريب إذا أتاه . فبنينا له دكانا من طين كان يجلس عليه. وإنا لجلوس ورسول الله صلى الله عليه وسلم في مجلسه، إذ أقبل رجل أحسن الناس وجها وأطيب الناس ريحا

''حضرت ابو ہریرہ اور ابوذر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے درمیان بیٹھا کرتے تھے۔ کوئی اجنبی آتا تو یہ نہیں جان پاتا تھا کہ (ان میں سے) وہ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں۔ چنانچہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ ہم ان کے بیٹھنے کی (نمایاں) جگہ بنا دیں تاکہ جب کوئی اجنبی آئے تو آپ کو پہچان لے۔ اس غرض کے لیے ہم نے آپ کے لیے مٹی کا ایک تھڑا بنا دیا جس پر آپ بیٹھنے لگے۔ (ایک موقع پر) ہم بھی بیٹھے ہوئے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی جگہ پر بیٹھے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

كـأن ثيابه لم يمسها دنس حتى سلم فى طـرف البساط. فـقـال: السلام عليك يا مـحمد. فـرد عليه السلام . قـال: أدنو يا مـحمد. قـال: ادنه . فـمـا زال يقول أدنو مـرارا ويقول له ادن حتى وضع يده على ركبتـي رسول الله صلى الله عليه وسلم. قال يامحمد أخبرنى ...(رقم ۴۹۰۵)

ہوئے تھے کہ ایک آدمی آیا، جس کا چہرا سب سے خوب صورت تھا۔ جس کی خوشبو سب سے اچھی تھی، گویا کہ اس کے کپڑوں کو میل نے چھوا تک نہیں تھا۔ اس نے بچھونے کے ایک طرف کھڑے ہو کر سلام کیا۔ اس نے کہا: یا محمد، السلام علیک۔ آپ نے جواب دیا۔ اس نے پوچھا: میں قریب آؤں؟ آپ نے کہا: اسے قریب آنے دو۔ وہ یہ کہتا رہا اور آپ یہ دہراتے رہے یہاں تک کہ اس نے اپنے ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں پر رکھ دیے اور کہا: یا محمد، بتائیے...۔''

شارح مشکوٰۃ ملا علی قاری نے وضاحت کی ہے کہ یہ واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانے میں پیش آیا۔ مسند امام اعظم میں بتایا گیا ہے کہ جبریل ایک نوجوان کی شکل میں آئے تھے۔ قیامت سے متعلق سوال کے جواب میں بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی قیامت کی علامات بتائیں اور دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جبریل کے کہنے پر یہ علامات بتائیں۔ اسی طرح بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اسی موقع پر بتا دیا تھا کہ آنے والے جبریل تھے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصریح تیسرے دن کی گئی تھی۔ اسی طرح کچھ روایات میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ حضور نے سائل کے جانے کے بعد صحابہ کو پیچھے بھی بھیجا تھا۔

اگر معنی کے پہلو سے دیکھیں تو حضرت عمر والی روایت جسے ہم نے اوپر نقل کیا ہے کے الفاظ زیادہ بہتر ہیں اور اگر معلومات کے پہلو سے دیکھیں تو حضرت ابوذر سے مروی روایت زیادہ بہتر ہے۔ بہر حال، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لوگوں کو سائل کے پیچھے بھیجنا تو قرین قیاس ہے، لیکن تیسرے دن والی بات درست معلوم نہیں ہوتی، البتہ یہ ممکن ہے کہ تیسرے دن اس واقعے کا دوبارہ ذکر ہوا ہو۔

کتابیات

بخاری، رقم ۴۸، ۴۴۰۴۔ نسائی، رقم ۴۹۰۴، ۴۹۰۵۔ ابوداؤد، رقم ۴۰۷۵۔ ترمذی، رقم ۲۵۳۵۔ ابن ماجہ، رقم ۶۲۔ احمد، رقم ۹، ۱۷۹، ۳۴۶، ۳۵۲۔

— ۲ —

عن أبى هريرة رضى الله عنه قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

يوما بارزا للناس . فـأتاه رجل، فقال: يارسول اللّٰه، ما الايمان؟ قال: أن تـؤمن باللّٰه و ملائكته و كتابه و لقائه و رسله و تؤمن بالبعث الآخر . قال: يـا رسـول اللّٰه، ماالاسلام؟ قال: الاسلام أن تعبد اللّٰه و لا تشرك به شيئا وتـقيـم الـصـلوة المكتوبة وتؤدى الزكوة المفروضة وتصوم رمضان . قـال: يا رسول اللّٰه، ما الاحسان؟ قال: أن تعبد اللّٰه كأنك تراه فإنك ان لا تـراه فـإنه يراك .قـال: يـارسـول اللّٰه، متـى الساعة؟ قال: ماالمسئول بـأعلم من السائل . ولـكن سأحدثك عن أشراطها . وإذا كـانت العراة الـحفاة رؤس الناس فذاك من أشراطها .واذا تطاول رعاء البهم فى البنيان فذاك من اشراطها . فـى خمس لا يعلمهن الا اللّٰه ثم تلا صلى اللّٰه عليه وسلم: إن اللّٰه عنده علم الساعة وينزل الغيث ويعلم ما فى الارحام وما تدرى نفس ماذا تكسب غدا وما تدرى نفس بأى أرض تموت ان اللّٰه عليم خبير. قال: ثم أدبر الرجل. فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: ردوا على الرجل. فأخذوا ليردوه، فلم يروا شيئا . فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: هذا جبريل جاء ليعلم الناس دينهم.

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن لوگوں کے لیے باہر[14] بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی آپ کے پاس آیا۔ اس نے کہا: رسول اللہ، ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتاب پر، اس سے ملاقات پر، اس کے رسولوں پر

---

[14] 'بارزا للناس': 'برز' کے معنی ہیں ظاہر ہونا۔ قرآن مجید میں زمین کے لیے 'بارزة' کی صفت بالکل نمایاں کے معنی میں آئی ہے یعنی اس پر کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے گی۔ اسی طرح 'برزوا لجالوت' میں یہ فعل سامنا ہونے کے معنی میں آیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس روایت میں یہ لفظ آپ کے لوگوں کے درمیان بات چیت اور ملاقات کے لیے موجود ہونے کے معنی میں آیا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اور آخرت میں اٹھائے جانے پر ایمان لائے۔ اس نے کہا: رسول اللہ، اسلام کیا ہے؟ آپ نے بتایا: اسلام یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائے، فرض[15] نماز پڑھے، فرض زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے۔ اس نے پوچھا: رسول اللہ، احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ کہ تو اللہ کی اس طرح عبادت کرے جیسے کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ پھر اگر تو اسے نہیں دیکھتا (تو کیا ہوا) وہ تو تمھیں دیکھتا ہے۔ اس نے سوال کیا: رسول اللہ، قیامت کب آئے گی؟ آپ نے کہا: جس سے پوچھا گیا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا، لیکن میں تمھیں اس کی علامتیں[16] بتاؤں گا۔ جب لونڈی اپنے آقا کو جنم دے تو یہ چیز اس کی علامتوں میں سے ایک ہے۔ جب تو دیکھے کہ یہ ننگ دھڑنگ لوگوں کے بادشاہ ہیں تو یہ اس کی علامتوں میں سے ایک ہے۔ جب تو دیکھے کہ یہ بھیڑوں کے چرواہے[17] عمارتیں بنانے میں مقابلہ کر رہے ہیں تو یہ اس کی علامتوں میں سے ایک ہے۔ یہ ان پانچ چیزوں میں سے ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پھر آپ نے یہ آیات تلاوت کیں: ان اللّٰہ عندہ ....۔ ''اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے، وہی بارش اتارتا ہے، اسے معلوم ہے رحموں میں کیا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کل کیا کمائے گا۔ کوئی نہیں جانتا کہ کس علاقے میں اس کی موت ہو گی۔ اللہ ہی علیم و خبیر ہے۔'' اس کے بعد وہ آدمی واپس چلا گیا۔ رسول اللہ نے لوگوں سے کہا: اس شخص کو واپس لے کر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۵؎ روایت میں نماز کے ساتھ 'المکتوبۃ' 'لازم کی گئی'، زکوٰۃ کے ساتھ 'المفروضہ' 'فرض کی گئی' کی صفت آئی ہے۔ قرآن مجید میں نماز کو 'کتابا موقوتا' قرار دیا گیا ہے۔ اسی مناسبت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے 'مکتوبۃ' قرار دیا ہے۔ یہاں اس صفت کے بیان سے نفلی نماز اور فرض نماز اور نفلی صدقات اور فرض صدقات کی حیثیت کو واضح کرنا ہے۔

'مکتوبۃ' اور 'مفروضۃ' ہم معنی الفاظ ہیں۔

۱۶؎ عربی میں علامتوں کے لیے 'اشراط' کا لفظ آیا ہے۔ یہ شرط کی جمع ہے۔ جو کسی چیز کی علامت یا اس کے پہلے سامنے والے حصے کے معنی میں آتا ہے۔

۱۷؎ اصل میں ہے: 'رعاء البھم'۔ 'رعاء' کا لفظ پچھلی روایت میں زیر بحث آ چکا ہے۔ 'بھم' کا لفظ بھیڑوں کے لیے آتا ہے، لیکن اس میں گائے اور بکری بھی شامل ہے۔ یعنی عربوں کے جانور جنھیں وہ ریوڑوں کی صورت میں چراتے تھے۔ اس لفظ سے وہ جانور مراد نہیں ہیں جو محض باربرداری کے کام آتے ہیں۔

آ ؤ۔ لوگ اسے لوٹانے کے لیے نکلے، لیکن انھیں کچھ نظر نہیں آیا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: یہ جبریل تھے۔ یہ لوگوں کو ان کا دین سکھانے آئے تھے۔''

معنی

اس روایت کے تمام اہم نکات اس سے پہلے کی روایت کے تحت زیر بحث آ چکے ہیں۔ اس روایت میں اضافی بات قرآن مجید کی آیت سے استشہاد ہے۔ اس آیت میں ان امور کا تذکرہ ہے جن کا علم انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر اس آیت میں بیان کیے گئے معاملات میں قدر مشترک معین کریں تو وہ مستقبل کا علم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے اپنے مستقبل کو جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں رکھا۔ قیامت بھی مستقبل کا معاملہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس طرح قرآن مجید نے یہ واضح کیا ہے کہ آدمی مستقبل میں پیش آنے والے ضرر اور نفع کو نہیں جان سکتا۔ جس طرح وہ موت کن حالات میں آئے گی اس سے واقف نہیں ہو سکتا اسی طرح وہ قیامت کے وقت سے بھی واقف نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

متون

ابوہریرہ سے مروی یہ روایت کچھ اختلاف کے ساتھ دوسری کتب حدیث میں بھی نقل ہوئی ہے۔ ان متون میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ کچھ لفظی فرق ہیں۔ مثلاً 'فأتاه رجل' کے بجائے 'إذ أتاه رجل یمشی' یا 'فأتاه جبریل' کے الفاظ آئے ہیں۔ ایک روایت میں 'الصلوٰة' کے ساتھ 'مکتوبة' کی صفت نہیں ہے۔ ایک روایت میں 'أمة' کے بجائے 'إمرأة' کا لفظ آیا ہے۔ زیر بحث روایت میں 'ربها' ہے بعض روایتوں میں 'ربتها' ہے۔ ایک روایت میں 'رعاء البهم' کی جگہ 'رعاء الغنم' روایت ہوا ہے۔ اسی طرح ایک روایت میں 'تطاول بنیان' والی نشانی بیان نہیں ہوئی۔ ہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کے ضمن میں حضرت ابوذر کی روایت کا حوالہ دیا تھا اور اس کی تمہید کو اقتباس کیا تھا۔ یہاں ہم مسند احمد کی روایت کے وہ حصے نقل کر رہے ہیں جس میں کچھ تفصیلات مختلف ہیں۔ اس کی تمہید کچھ اس طرح سے ہے:

عن عامر أن النبی صلی اللّٰه علیه و سلم بینما هو جالس فی مجلس . فیه أصحابه . جاء ه جبریل علیه السلام فی غیر صورته یحسبه رجلا من المسلمین. (رقم ۱۶۵۴۱)

''حضرت عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، جس میں آپ کے اصحاب بھی تھے کہ آپ کے پاس جبریل ایسی صورت بدل کر آئے کہ (دیکھنے والا انھیں) مسلمانوں میں سے ایک مرد خیال کرے۔''

اس میں اسلام کی تفصیل میں روزہ اور حج نہیں ہیں۔ ایمانیات کی تفصیل میں جنت، جہنم، حساب اور میزان کا اضافہ ہے۔ ہر سوال کے جواب میں 'إذا فعلت ذلك فقد أسلمت '،'...آمنت 'اور'...أحسنت' کا تاکیدی جملہ ہے۔ روایت میں اس مکالمے کے اس حصے کے بعد راوی کا تاثر بیان ہوا ہے: 'نسمع رجع رسول الله صلى الله عليه وسلم إليه ولا يرى الذى يكلمه ولا يسمع كلامه ' یہ تاثر بے محل لگتا ہے۔ اس لیے کہ روایت کے شروع میں جبریل کے غیر فرشتہ کی صورت میں آنے ذکر ہوا ہے اور آخر میں اس کے جاتے ہوئے دکھائی نہ دینے کا معاملہ بیان ہوا ہے۔ یہ دونوں باتیں جبریل علیہ السلام کے انسانی صورت میں آنے کو واضح کرتی ہیں۔ اس صورت میں یہ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ دیکھنے والوں کو نہ بولنے والا دکھائی دے رہا تھا اور نہ اس کی آواز آ رہی تھی۔ قیامت پر سوال کے جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی آیت پڑھی۔ یعنی اس روایت میں 'ما المسؤل... ' والا جملہ نقل نہیں ہوا جو اس روایت کے تقریباً تمام متون میں نقل ہوا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب سن کر حضرت جبریل علیہ السلام نے خود قیامت کی نشانیاں بتائیں:

فقال السائل: يا رسول الله إن شئت حدثتك بعلامتين تكونان قبلها . فقال: حدثني. فقال: إذا رأيت الأمة تلد ربها ويطول اهل البنيان بالبنيان وعاد العالة الحفاة رؤس الناس . قال: ومن أولئك، يا رسول الله؟ قال: العريب. قال: ثم ولى، فلما لم نر طريقه بعد قال: سبحان الله ثلاثا . هذا جبريل جاء ليعلم الناس دينهم والذى نفس محمد بيده ماجاءنى قط إلا وأنا نعرفه إلا أن تكون هذه المرة. (ایضاً)

''سائل نے پوچھا: یارسول اللہ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو اس سے پہلے کی دو نشانیاں بتاؤں۔ آپ نے کہا: بیان کرو۔ اس نے کہا: جب آپ دیکھیں کہ لونڈی اپنے آقا کو جنم دے، عمارتوں والے اپنی عمارتوں کو اونچا کرنے لگیں اور یہ ننگ دھڑنگ فقیر لوگوں کے سردار بن جائیں۔ آپ نے پوچھا: یہ کون ہوں گے۔ کہا: عرب۔ پھر وہ پلٹ گیا۔ ہم نے جب بعد میں اسے راہ میں نہیں دیکھا تو حضور نے تین دفعہ سبحان اللہ کہا، یہ جبریل تھے جو لوگوں کو ان کا دین سکھانے آئے تھے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے، یہ میرے پاس کبھی اس طرح نہیں آئے کہ میں انھیں پہچان نہ پاؤں۔ اس بار ایسا ہی ہوا ہے۔''

کتابیات

بخاری، رقم ۴۸، ۴۴۰۴۔ ابن ماجہ، رقم ۶۲، ۴۰۳۴۔ نسائی، رقم ۴۹۰۵۔ احمد، رقم ۹۱۳۷، ۱۶۵۴۱۔

عن أبی هريرة رضی اللّٰه عنه قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: سلونی . فهابوه أن يسألوه. فجاء رجل . فجلس عند ركبتيه. فقال: يارسول اللّٰه، ما الاسلام؟ قال: لا تشرك باللّٰه شيئا وتقيم الصلاة وتؤتی الزكاة وتصوم رمضان. قال: صدقت ، قال: يارسول اللّٰه، ماالايمان؟ قال: أن تؤمن باللّٰه وملائكته وكتابه ولقائه ورسله وتؤمن بالبعث وتؤمن بالقدر كله. قال: صدقت . قال: يا رسول اللّٰه، ما الاحسان؟قال: أن تخشی اللّٰه كأنك تراه فأنك إن لاتكن تراه فإنه يراك. قال: صدقت . قال: يارسول اللّٰه، متی الساعة؟ قال: ماالمسئول عنها بأعلم من السائل وسأحدثك عن أشراطها . إذا رأيت المرأة تلد ربها فذاك من اشراطها. وإذا رأيت الحفاة العراة الصم البكم ملوك الأرض فذاك من أشراطها. وإذا رأيت رعاء البهم يتطاولون فی البنيان، فذاك من أشراطها فی خمس من الغيب لا يعلمهن إلا اللّٰه ثم قرأ: إن اللّٰه عنده علم الساعة وينزل الغيث ويعلم ما فی الأرحام وماتدری نفس ما ذا تكسب غدا وما تدری نفس بأی أرض تموت إن اللّٰه عليم خبير. قال: ثم قام الرجل . فقال رسول اللّٰهصلی اللّٰه علیه وسلم ردوه علی فالتمس فلم يجدوه . فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم هذا جبريل أراد أن تعلموا إذ لم تسألوا.

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے کہ مجھ

سے پوچھو، لیکن لوگ آپ سے سوال کرنے سے ڈرتے تھے۔ پھر ایک آدمی آیا اور آپ کے گھٹنوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے آپ سے پوچھا: یارسول اللہ، اسلام کیا ہے؟ آپ نے کہا: اسلام یہ ہے کہ تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائے، نماز کا اہتمام کرے، زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے۔ اس نے کہا: آپ نے درست فرمایا۔ پوچھا: یارسول اللہ، ایمان کیا ہے؟ آپ نے کہا: ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر ایمان لائے، اس کے فرشتوں، اس کی کتاب، اس سے ملاقات اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔ تو دوبارہ اٹھائے جانے اور تمام تر تقدیر پر ایمان رکھے۔ اس نے کہا: آپ نے درست فرمایا۔ پوچھا: یارسول اللہ، احسان کیا ہے؟ آپ نے کہا: احسان یہ ہے کہ تو اللہ سے اس طرح ڈرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ پھر اگر تم اسے نہیں دیکھتے (تو کیا ہوا) وہ تو تمھیں دیکھتا ہے۔ اس نے کہا: آپ نے درست فرمایا۔ پوچھا: یارسول اللہ، قیامت کب ہوگی۔ آپ نے کہا: جس سے پوچھا گیا ہے وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا اور میں تمھیں اس کی نشانیاں بتاؤں گا۔ جب تو دیکھے کہ عورت اپنے آقا جنم دینے لگی ہے تو یہ اس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اور جب تو دیکھے کہ یہ برہنہ پا، ننگ دھڑنگ اور گونگے بہرے اس سرزمین کے بادشاہ بن گئے ہیں تو یہ اس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اور جب تو دیکھے کہ یہ گلوں کے چرانے والے عمارتیں اونچی کرنے میں ایک دوسرے سے مسابقت کر رہے ہیں تو یہ اس کی نشانیوں میں سے ہے۔ قیامت ان پانچ چیزوں میں سے ہے، جنھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اسی کے پاس قیامت کا علم ہے، وہی بارش اتارتا ہے، اسے معلوم ہے رحموں میں کیا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کل کیا کمائے گا۔ کوئی نہیں جانتا کہ کس علاقے میں اس کی موت ہوگی۔ اللہ ہی علیم خبیر ہے۔ پھر وہ آدمی کھڑا ہوا (اور چلا گیا)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اسے میرے پاس واپس لاؤ۔ اسے تلاش کیا گیا، مگر لوگوں نے اسے نہیں پایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ جبریل تھے۔ انھوں نے چاہا کہ تم سیکھو جبکہ تم سوال نہیں کر رہے ہو۔"

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

معنی

اس روایت کے اہم مباحث پچھلی روایات میں زیر بحث آ چکے ہیں۔ اس روایت میں دو باتیں سابقہ روایتوں سے مختلف ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے آغاز میں حضرت جبریل کے آنے کی وجہ بیان کی گئی ہے اور روایت کا انجام بھی اسی سبب کی طرف اشارے پر ہوا ہے۔ مزید یہ کہ روایت کا یہ آخری جملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے بیان ہوا ہے۔ ممکن ہے یہ اضافہ درست ہو، لیکن پچھلی روایات میں جو بات بیان ہوئی ہے وہ روایت کے مضمون سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ راوی نے دو الگ سے موجود مختلف چیزوں کو خود سے ملا دیا ہے۔

دوسری چیز لونڈی کے بجائے عورت کے لفظ کا آنا ہے۔ یہ فرق درست نہیں ہے۔ اس نشانی کی جو بھی وضاحت کی جائے لونڈی کا لفظ ہی موزوں محسوس ہوتا ہے۔

کتابیات

اس روایت کے مختلف متون کے حوالوں کے لیے دیکھیے حدیث ۹ اور ۱۰ کی کتابیات۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ساجد حمید

شرح موطا امام مالک

باب وقوت الصلوٰۃ

نماز کے اوقات

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

[۳] وحدثنی یحییٰ عن مالك عن زید بن اسلم عن عطاء بن یسار أنه قال: جَاءَ رَجُلٌ اِلَی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَهُ عَنْ وَقْتِ صَلٰوةِ الصُّبْحِ. قَالَ: فَسَکَتَ عَنْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰی إِذَا کَانَ مِنَ الْغَدِ صَلَّی الصُّبْحَ حِیْنَ طَلَعَ الْفَجْرُ. ثُمَّ صَلَّی الصُّبْحَ مِنَ الْغَدِ بَعْدَ أَنْ أَسْفَرَ. ثُمَّ قَالَ: أَیْنَ السَّائِلُ عَنْ وَقْتِ الصَّلٰوةِ؟ قَالَ: هَأَنَذَا، یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ. فَقَالَ: مَا بَیْنَ هَذَیْنِ وَقْتٌ.

''عطا بن یسار نے بتایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا، اس نے آپ سے صبح کی نماز کا وقت دریافت کیا۔ عطا کہتے ہیں کہ آپ اس کی بات سن کر خاموش رہے۔ جب اگلی صبح ہوئی تو آپ نے اس وقت نماز پڑھی جب فجر طلوع ہوئی اور اس سے اگلے دن اجالا ہونے پر فجر پڑھی۔ پھر آپ نے

پوچھا: فجر کا وقت پوچھنے والا کہاں ہے؟ اس آدمی نے کہا: حضور میں یہاں ہوں۔ آپ نے فرمایا: (میں نے جن دو اوقات میں نماز پڑھی) فجر کا وقت انھی دونوں کے مابین ہے۔''

شرح

سائل نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فجر کا وقت پوچھا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب عمل سے دیا ہے۔ اوقات نماز کی تمام تفصیلات ہم پچھلی روایت میں بیان کر چکے ہیں یہاں ہم اس پہلو سے کوئی بات عرض نہیں کرنا چاہتے۔ بس اتنی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب سے معلوم ہو رہی ہے کہ اس شخص نے یہی پوچھا ہوگا کہ نماز فجر کا وقت کب سے کب تک ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا ایک نہایت اعلیٰ نمونہ یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک سائل آپ سے سوال کرتا ہے۔ آپ اسے چند جملوں میں جواب دے کر فارغ کر سکتے تھے، لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ دو دن نماز پڑھ کر اسے وقت بتایا ہے کہ یہ فجر کا وقت ہے۔

احادیث میں دونوں طرح کے واقعات ملتے ہیں، یعنی آپ نے محض زبانی وقت بتا دینے پر اکتفا بھی کی اور دو دن نماز پڑھ کر وقت بھی بتایا۔ یہ فرق غالباً سائل کی اہمیت، طبیعت اور مزاج کی بنا پر کیا گیا ہو۔ یعنی یہ ہوسکتا ہے کہ سائل ایسا ہو کہ اس نے دور جا کر اپنی قوم یا قبیلے کو آگاہ کرنا ہو۔ اس لیے آپ نے اس طرح سے وقت بتایا کہ وہ بھول نہ جائے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک سادہ مزاج آدمی کی تشفی یا وضوح اس کے بغیر نہیں ہوگا۔ انبیا بالخصوص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دین کے بارے میں پوچھنے والوں کے لیے نہایت شفیق استاد کی طرح ہوتے تھے جو اپنی بات سمجھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ سیرت النبی ایسے ایمان افروز واقعات سے بھری ہوئی ہے۔

درایت

قرآن وسنت سے تعلق

موطا کی یہ روایت فجر کے وقت کا تعین کر رہی ہے۔ سنت میں صبح کی نماز کو فجر کہا گیا ہے یہ لفظ فجر کے وقت کا پتا دیتا ہے۔ آپ نے اسی وقت کی وضاحت کی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوالات اس لیے کیے گئے ہیں کہ داعی کا ہر سامع مختلف انداز سے سوچتا ہے۔ مثلاً ایک سائل جب فجر کا لفظ سنتا ہے تو وہ سوچ سکتا ہے کہ لفظ جو بولا جا رہا ہے وہ تو ہمیں معلوم ہے،

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لیکن ہوسکتا ہے شریعت کی تحدیدات کچھ اور ہوں۔ اس وجہ سے وہ سوال پوچھتا ہے۔ اس جیسے کئی اور محرکات ہوتے ہیں، مثلاً رسول سے حصول توجہ اور التفات، اپنے عمل کی صحت کے بارے میں تسلی، اپنے ساتھیوں کے ساتھ بحث مباحثے میں فیصلہ کے لیے قول فیصل وغیرہ۔

یہ روایت اسی محل کی ہے۔ یعنی اس روایت میں سنت میں متعین کردہ وقت فجر کا بیان ہے جسے ایک سائل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔ پچھلی روایت میں ہم عرض کر چکے ہیں کہ قرآن مجید نے بھی اوقات کی طرف واضح نشان دہی کی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فجر کے وقت کے لیے فجر ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ (بنی اسرائیل ۱۷: ۷۸۔ ۷۹)

احادیث باب پر نظر

اس طرح کے دو واقعات کتب احادیث میں آئے ہیں، جس میں کسی شخص نے اوقات پوچھے اور آپ نے بتا دیے۔ ایک میں صرف وقت فجر کا مسئلہ زیر بحث ہے اور دوسرے میں پانچوں نمازوں کا۔ دونوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دن نماز پڑھ کر دکھائی ہے۔ ایک تیسری روایت (مسلم، رقم ۶۱۲) بھی ہے جس کا ذکر ہم پچھلی روایت کی شرح میں کر چکے ہیں۔ اس میں آپ نے نماز پڑھ کر دکھانے کے بجائے محض اوقات بتائے ہیں۔ ذیل میں ہم اس روایت کا متن پیش کر رہے ہیں، جس میں آپ سے نمازوں کے اوقات پوچھے گئے اور آپ نے پانچوں نمازیں پڑھ کر وقت بتایا:

عن بریدة عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم: أن رجلا سأله عن وقت الصلاة فقال له : صل معنا هذین یعنی الیومین . فلما زالت الشمس أمر بلالا فأذن ثم أمره فأقام الظهر ثم أمره فأقام العصر والشمس مرتفعة بیضاء نقیة ثم أمره فأقام المغرب حین غابت الشمس ثم أمره فأقام العشاء حین غاب الشفق ثم أمره فأقام الفجر حین طلع الفجر فلما ان کان الیوم الثانی أمره فأبرد بالظهر فأبرد بها فأنعم ان یبرد بها وصلی العصر والشمس مرتفعة أخرها فوق الذی

''حضرت بریدہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کا وقت پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ یہ دو دن ہمارے ساتھ نماز پڑھو۔ چنانچہ جب (پہلے دن) سورج زوال پر آیا تو آپ نے حضرت بلال کو اذان کا حکم دیا تو آپ نے اسی وقت نماز کھڑی کر دی۔ پھر کچھ دیر بعد آپ نے عصر کی اذان کا حکم دیا اور آپ نے عصر کی جماعت کرائی، جبکہ سورج ابھی بلند اور سفید روشن تھا۔ پھر سورج کے چھپ جانے پر آپ نے مغرب کی اذان کا حکم دیا اور آپ نے مغرب کی جماعت کرائی۔ پھر شفق کے غائب ہونے پر آپ نے عشا کی اذان کا حکم دیا اور آپ نے جماعت کرائی۔ پھر صبح کو آپ نے فجر کے طلوع ہوتے ہی اذان کا حکم دیا اور آپ نے جماعت کرائی۔ پھر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

كان. وصلى الفجر فاسفر بها ثم قال: أين السائل عن وقت الصلاة؟فقال الرجل: أنا يا رسول اللّٰه. قال: وقت صلاتكم بين ما رأيتم. (مسلم،رقم۶۱۲)

دوسرے دن حضرت بلال کو اذان کا حکم دیا کہ وہ دوپہر کو ٹھنڈا ہونے دیں، پھر آپ نے بھی ظہر دیر سے پڑھائی اور اس کو پسند کیا کہ دوپہر کو ظہر کے لیے ٹھنڈا کیا جائے۔ پھر آپ نے عصر کا حکم دیا، سورج ابھی بلند تھا، لیکن آپ نے پچھلے دن کے مقابلے میں تاخیر کی۔ اس دن آپ نے مغرب شفق ڈوبنے پر پڑھی۔ اور عشا ایک تہائی رات بیتنے پر پڑھی۔ اور فجر آپ نے روشنی میں پڑھی۔ پھر آپ نے کہا: وقت پوچھنے والا کہاں ہے؟ سائل نے کہا: حضور میں (ادھر ہوں)۔ آپ نے فرمایا: جو اوقات تم نے دیکھے انھی کے درمیان نماز کا وقت ہے۔''

موطا کی روایت میں ہے کہ سائل کے جواب میں آپ خاموش رہے۔ بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ: ''آج اور کل ہمارے ساتھ نماز پڑھیے''۔ 'صلها معي اليوم وغدا' (مسند ابی یعلیٰ، رقم ۲۰۹۷) ہمارے خیال میں اسی روایت کے الفاظ بہتر ہیں یا پھر دونوں کو جمع کر لینا چاہیے کہ آپ نے سوال کے اصل جواب کے بارے میں خاموشی اختیار کی، مگر کہا کہ دو دن ہمارے ساتھ نماز پڑھیے۔

اس روایت کے بارے میں اس طرح کے سوالات کہ سوال پوچھنے پر خاموشی اختیار کر لینا کیا جائز ہے؟ اگر آپ کی وفات ہو جاتی تو سائل محروم رہتا؟ وغیرہ خاص طرح کی منطق سے پیدا ہوئے ہوئے سوالات ہیں۔ جب آپ نے یہ فیصلہ فرما لیا کہ میں اسے نماز پڑھ کر اپنے عمل سے جواب دوں گا۔ تو یہ جواب کو ٹالنا نہیں ہے۔ اب اگر آپ کی وفات بھی ہو جاتی تو آپ پر نہ دین چھپانے کا الزام آتا نہ حاجت مند کی حاجت براری میں تاخیر کا۔ سادہ لفظوں میں یوں سمجھیں کہ آپ نے جواب دینے سے انکار کیا ہے اور نہ اسے جان چھڑانے کے لیے ٹالا ہے۔ اگر آپ نے ایسا کیا ہوتا تو یقیناً یہ غلط بات ہوتی۔ کسی مصلحت یا حکمت کے تحت جواب میں تاخیر کسی طرح جائز ناجائز کی بحث میں نہیں آتی۔

ابو یعلیٰ کی مذکورہ بالا روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ سفر میں پیش آیا جب آپ جحفہ میں تھے۔ پہلی فجر آپ نے جحفہ میں اور دوسری ذی طوی میں ادا کی۔

روایت

عطا بن یسار تقریباً ۸۴ سال کی عمر میں ۱۰۳ یا ۹۴ ہجری میں فوت ہوئے۔ اس اعتبار سے ان کی ولادت نبی صلی اللہ علیہ

وسلم کی وفات کے قریب یا آپ کی وفات کے ۹ سال بعد ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ روایت مرسل ہے، لیکن کتب حدیث میں اس طرح کی روایتیں موجود ہیں جن سے اس کے مضمون کی تائید ہوتی ہے۔

صحاح ستہ میں یہ (صرف وقت فجر کے سائل والا) متن صرف سنن النسائی (رقم ۵۴۴) میں آیا ہے۔ نسائی کی یہ روایت موصول ہے مرسل نہیں ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

قانون عبادات

(۱۴)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حج وعمرہ کا طریقہ

حج وعمرہ کے لیے جو طریقہ شریعت میں مقرر کیا گیا ہے، وہ یہ ہے:

عمرہ

اس عبادت کی نیت سے اس کا احرام باندھا جائے،

باہر سے آنے والے یہ احرام اپنی میقات سے باندھیں؛ مقیم خواہ وہ مکی ہوں یا عارضی طور پر مکہ میں ٹھیرے ہوئے ہوں، اسے حدود حرم سے باہر قریب کی کسی جگہ سے باندھیں؛ اور جو لوگ ان حدود سے باہر، لیکن میقات کے اندر رہتے ہوں، ان کی میقات وہی جگہ ہے، جہاں وہ مقیم ہیں، وہ وہیں سے احرام باندھ لیں اور تلبیہ پڑھنا شروع کر دیں،

بیت اللہ میں پہنچنے تک تلبیہ کا ورد جاری رکھا جائے،

وہاں پہنچ کر بیت اللہ کا طواف کیا جائے،

پھر صفا ومروہ کی سعی کی جائے،

ہدی کے جانور ساتھ ہوں تو ان کی قربانی کی جائے،

قربانی کے بعد مرد سر منڈوا کر یا حجامت کرا کے اور عورتیں اپنی چوٹی کے آخر سے تھوڑے سے بال کاٹ کر احرام کھول دیں۔

یہ احرام ایک اصطلاح ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب وہ شہوت کی کوئی بات نہیں کریں گے؛ زیب وزینت کی کوئی چیز،

مثلاً خوشبو وغیرہ استعمال نہیں کریں گے؛ ناخن نہیں تراشیں گے، نہ جسم کے کسی حصے کے بال اتاریں گے، نہ میل کچیل دور کریں گے، یہاں تک کہ اپنے بدن کی جوئیں بھی نہیں ماریں گے؛ شکار نہیں کریں گے؛ سلے ہوئے کپڑے نہیں پہنیں گے؛ اپنا سر، چہرہ اور پاؤں کے اوپر کا حصہ کھلا رکھیں گے، اور ایک چادر تہ بند کے طور پر باندھیں گے اور ایک اوڑھ لیں گے۔

عورتیں، البتہ سلے ہوئے کپڑے پہنیں گی، اور سر اور پاؤں بھی ڈھانپ سکیں گی۔ ان کے لیے صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھنے ضروری ہیں۔

تلبیہ سے مراد، 'لبیك اللّٰھم لبیك؛ لبیك لاشریك لك، لبیك؛ ان الحمد و النعمة لك، والملك؛ لاشریك لك' کا ورد ہے جو احرام باندھتے ہی شروع ہوتا اور بیت اللہ میں پہنچنے تک برابر جاری رہتا ہے۔ حج وعمرہ کے لیے تنہا یہی ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔

طواف ان سات پھیروں کو کہتے ہیں جو ہر طرح کی نجاست سے پاک ہو کر بیت اللہ کے گرد لگائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر پھیرا حجر اسود سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتا ہے اور ہر پھیرے کی ابتدا میں حجر اسود کا استلام کیا جاتا ہے۔ یہ حجر اسود کو چومنے یا ہاتھ سے اس کو چھو کر اپنا ہاتھ چوم لینے کے لیے ایک اصطلاح ہے۔ ہجوم کی صورت میں ہاتھ سے یا ہاتھ کی چھڑی سے یا اس طرح کی کسی دوسری چیز سے اشارہ کر دینا بھی اس کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔

سعی سے مراد صفا و مروہ کا طواف ہے۔ یہ بھی سات پھیرے ہیں جو صفا سے شروع ہوتے ہیں۔ صفا سے مروہ تک ایک اور مروہ سے صفا تک دوسرا پھیرا شمار کیا جاتا ہے۔ ان میں سے آخری پھیرا مروہ پر ختم ہوتا ہے۔

قربانی کی طرح صفا و مروہ کی یہ سعی بھی بطور تطوع کی جاتی ہے۔ یہ عمرے کا کوئی لازمی حصہ نہیں ہے۔ عمرہ اس کے بغیر بھی ہر لحاظ سے مکمل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ، فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَاجُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا، وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ، فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ .(البقرہ۲: ۱۵۸)

''صفا اور مروہ یقیناً اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو اس گھر کا حج یا عمرہ کرنے کے لیے آئیں، اُن پر کوئی حرج نہیں کہ وہ ان کا طواف بھی کر لیں، (بلکہ یہ ایک نیکی کا کام ہے) اور جس نے اپنے شوق سے نیکی کا کوئی کام کیا، اللہ اُسے قبول کرنے والا ہے، اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔''

ہدی کا لفظ ان جانوروں کے لیے بولا جاتا ہے جو حرم میں قربانی کے لیے خاص کیے گئے ہوں۔ دوسرے جانوروں سے ان کو ممیّز رکھنے کے لیے ان کے جسم پر نشان لگائے جاتے اور گلے میں پٹے ڈالے جاتے ہیں۔ قرآن نے 'القلائد'[۲۱۵] کی تعبیر

۲۱۵؎ المائدہ ۵: ۲، ۹۷۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ان کے لیے اسی بنا پر اختیار کی ہے۔

حج

عمرے کی طرح حج کی ابتدا بھی احرام سے ہوتی ہے۔ چنانچہ پہلا کام یہی ہے کہ حج کی نیت سے اس کا احرام باندھا جائے،

باہر سے آنے والے یہ احرام اپنے میقات سے باندھیں؛ مقیم خواہ وہ مکی ہوں یا عارضی طور پر مکہ میں ٹھیرے ہوئے ہوں یا حدود حرم سے باہر، لیکن میقات کے اندر رہتے ہوں، ان کی میقات وہی جگہ ہے، جہاں وہ مقیم ہیں، وہ وہیں سے احرام باندھ لیں اور تلبیہ پڑھنا شروع کر دیں،

۸/ ذوالحجہ کو منیٰ کے لیے روانہ ہوں اور وہاں قیام کریں،

۹/ ذوالحجہ کی صبح عرفات کے لیے روانہ ہوں،

وہاں پہنچ کر امام ظہر کی نماز سے پہلے حج کا خطبہ دے، پھر ظہر اور عصر کی نماز جمع اور قصر کر کے پڑھی جائے،

نماز سے فارغ ہو کر جتنی دیر کے لیے ممکن ہو، اللہ تعالیٰ کے حضور میں تسبیح وتحمید، تکبیر وتہلیل اور دعا ومناجات کی جائے،

غروب آفتاب کے بعد مزدلفہ کے لیے روانہ ہوں،

وہاں پہنچ کر مغرب اور عشا کی نماز جمع اور قصر کر کے پڑھی جائے،

رات کو اسی میدان میں قیام کیا جائے،

فجر کی نماز کے بعد یہاں بھی تھوڑی دیر کے لیے عرفات ہی کی طرح تسبیح وتحمید، تکبیر وتہلیل اور دعا ومناجات کی جائے،

پھر منیٰ کے لیے روانہ ہوں اور وہاں جمرۂ عقبہ کے پاس پہنچ کر تلبیہ پڑھنا بند کر دیا جائے اور اس جمرے کو سات کنکریاں ماری جائیں،

ہدی کے جانور ساتھ ہوں یا نذر اور کفارے کی کوئی قربانی واجب ہو چکی ہو تو یہ قربانی کی جائے،

پھر مرد سر منڈوا کر یا حجامت کرا کے اور عورتیں اپنی چوٹی کے آخر سے تھوڑے سے بال کاٹ کر احرام کا لباس اتار دیں،

پھر بیت اللہ پہنچ کر اس کا طواف کیا جائے،

احرام کی تمام پابندیاں اس کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گی، اس کے بعد اگر ارادہ ہو تو بطور تطوع صفا ومروہ کی سعی بھی کر لی جائے،

پھر منیٰ واپس پہنچ کر دو یا تین دن قیام کیا جائے اور روزانہ پہلے جمرۃ الاولیٰ، پھر جمرۃ الوسطیٰ اور اس کے بعد جمرۃ الاخریٰ کو سات سات کنکریاں ماری جائیں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے حج وعمرہ کے مناسک یہی ہیں۔ قرآن مجید نے ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی،

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

صرف اتنا کیا ہے کہ ان سے متعلق بعض فقہی مسائل کی توضیح فرمادی ہے۔

یہ پانچ احکام ہیں:

پہلا حکم یہ ہے کہ حج وعمرہ کے تعلق سے جو حرمتیں اللہ تعالیٰ نے قائم کردی ہیں، ان کی تعظیم ایمان کا تقاضا ہے، وہ ہر حال میں قائم رہنی چاہییں۔ تاہم کوئی دوسرا فریق اگر انھیں ملحوظ رکھنے سے انکار کردیتا ہے تو اس کے بدلے میں مسلمانوں کو بھی حق ہے کہ وہ برابر کا اقدام کریں، اس لیے کہ اس طرح کی حرمتیں باہمی طور پر ہی قائم رہ سکتی ہیں، انھیں کوئی فریق اپنے طور پر قائم نہیں رکھ سکتا:

اَلشَّھۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّھۡرِ الۡحَرَامِ، وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ، فَمَنِ اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ، فَاعۡتَدُوۡا عَلَیۡہِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ، وَاتَّقُوا اللّٰہَ، وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الۡمُتَّقِیۡنَ. (البقرہ ۲: ۱۹۴)

''ماہ حرام کا بدلہ ماہ حرام ہے اور (اسی طرح) دوسری حرمتوں کے بدلے ہیں۔ لہٰذا جو تم پر زیادتی کریں، انھیں اس زیادتی کے برابر ہی جواب دو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان لو کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے جو اس کے حدود کی پابندی کرتے ہیں۔''

استاذ امام امین احسن اصلاحی اس حکم کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ اشہر حرم میں یا حدود حرم میں لڑائی بھڑائی ہے تو بہت بڑا گناہ، لیکن جب کفار تمھارے لیے اس کی حرمت کا لحاظ نہیں کرتے تو تمھیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ قصاص کے طور پر تم بھی ان کو ان کی حرمت سے محروم کردو۔ ہر شخص کی جان شریعت میں محترم ہے، لیکن جب ایک شخص دوسرے کی جان کا احترام نہیں کرتا، اس کو قتل کردیتا ہے تو اس کے قصاص میں وہ بھی حرمت جان کے حق سے محروم کرکے قتل کردیا جاتا ہے۔ اسی طرح اشہر حرم اور حدود حرم کا احترام مسلم ہے بشرطیکہ کفار بھی ان کا احترام ملحوظ رکھیں اور ان میں دوسروں کو ظلم وستم کا ہدف نہ بنائیں، لیکن جب ان کی تلواریں ان مہینوں میں اور اس بلد امین میں بے نیام ہوتی ہیں تو وہ سزاوار ہیں کہ ان کے قصاص میں وہ بھی ان کے امن واحترام کے حقوق سے محروم کیے جائیں۔ مزید فرمایا کہ جس طرح اشہر حرم کا یہ قصاص ضروری ہے، اسی طرح دوسری حرمتوں کا قصاص بھی ہے۔ یعنی جس محترم چیز کے حقوق حرمت سے وہ تمھیں محروم کریں تم بھی اس کے قصاص میں اس کے حق حرمت سے انھیں محروم کرنے کا حق رکھتے ہو۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۴۷۹)

دوسرا حکم یہ ہے کہ اس اجازت کے باوجود مسلمان اپنی طرف سے کوئی پیش قدمی نہیں کرسکتے۔ یہ اللہ کی حرمتیں ہیں، ان کے توڑنے میں پہل ایک بدترین جرم ہے۔ اس کا ارتکاب کسی حال میں بھی نہیں ہونا چاہیے۔ بیت الحرام پر حملہ خدا کے گھر پر حملہ ہے، جن جانوروں کے گلے میں خدا کی تخصیص کے پٹے بندھ گئے ہیں اور جو اللہ کے بندے اس کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں رخت سفر باندھ کر نکلے ہیں، ان کو نقصان پہنچانے کے درپے ہونا خود اللہ، پروردگار عالم سے تعرض کرنے کے مترادف ہے۔ اس وجہ سے کسی قوم کی دشمنی بھی مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ وہ اس معاملے میں حدود

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سے تجاوز کریں۔ ان پر واضح رہنا چاہیے کہ جو پروردگار اپنے عہد و میثاق سے قوموں پر کرم فرماتا اور انھیں سرفرازی بخشتا ہے، اس کے ہاں اس عہد و میثاق کے توڑنے کی پاداش بھی بڑی ہی سخت ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ، وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ، وَلَا الْهَدْیَ، وَلَا الْقَلَآئِدَ، وَلَآ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ، یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا... وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْکُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا، وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی، وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ، اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ. (المائدہ ۵:۲)

''ایمان والو، اللہ کے شعائر کی بے حرمتی نہ کرو، نہ حرام مہینوں کی، نہ ہدی کے جانوروں کی، نہ (اُن میں سے بالخصوص) اُن جانوروں کی جن کے گلے میں نذر کے پٹے بندھے ہوئے ہوں، اور نہ بیت الحرام کے عازمین کی جو اپنے پروردگار کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں نکلتے ہیں... اور کچھ لوگوں نے مسجد الحرام کا راستہ تمھارے لیے بند کر دیا ہے تو اُن کے ساتھ اس بنا پر تمھاری دشمنی بھی تمھیں ایسا مشتعل نہ کر دے کہ تم حدود سے تجاوز کرو۔ (نہیں، تم حدود الٰہی کے پابند رہو)، اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو، اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اس لیے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔''

جَعَلَ اللّٰهُ الْکَعْبَةَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ، وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ، وَالْهَدْیَ، وَالْقَلَآئِدَ. ذٰلِکَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ، وَمَا فِی الْاَرْضِ، وَاَنَّ اللّٰهَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ. اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ، وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ.

(المائدہ ۵: ۹۷۔۹۸)

''اللہ نے بیت الحرام کعبہ کو لوگوں کے لیے مرکز بنایا اور حرمت کے مہینوں، قربانی کے جانوروں اور (اُن میں سے بالخصوص) اُن جانوروں کو (شعیرہ ٹھیرایا ہے) جن کے گلے میں نذر کے پٹے بندھے ہوئے ہوں۔ یہ اس لیے کہ تمھیں معلوم ہو جائے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ زمین و آسمان میں ہے اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ خبردار ہو جاؤ کہ اللہ سخت سزا دینے والا بھی ہے اور اللہ بخشنے والا اور مہربان بھی ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تیسرا حکم یہ ہے کہ حالت احرام میں شکار کی ممانعت صرف خشکی کے جانوروں کے لیے ہے، دریائی جانوروں کا شکار کرنا یا دوسروں کا کیا ہوا شکار کھا لینا، دونوں جائز ہیں۔ یہ رخصت اس لیے دی گئی ہے کہ خشکی کے سفر میں اگر زاد راہ ختم ہو جائے تو اسے کسی نہ کسی طرح حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن دریائی سفر میں اس طرح کے موقعوں پر شکار کے سوا کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں

رہتا۔ تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ لوگ اس رخصت سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ خشکی کا شکار ہر حال میں ممنوع ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص جانتے بوجھتے اس گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اسے کفارہ ادا کرنا چاہیے۔

اس کی تین صورتیں ہیں:

جس طرح کا جانور شکار کیا گیا ہے، اسی قبیل کا کوئی جانور گھریلو چوپایوں میں سے قربانی کے لیے بیت اللہ بھیجا جائے۔

اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس جانور کی قیمت کی نسبت سے مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔

یہ بھی دشوار ہو تو اتنے روزے رکھے جائیں، جتنے مسکینوں کو کھانا کھلانا کسی شخص پر عائد ہوتا ہے۔

رہی یہ بات کے جانوروں کا بدل کیا ہے یا اگر جانور کی قربانی متعذر ہے تو اس کی قیمت کیا ہو گی یا اس کے بدلے میں کتنے مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے گا یا کتنے روزے رکھے جائیں گے تو اس کا فیصلہ مسلمانوں میں سے دو ثقہ آدمی کریں گے تاکہ جرم کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے اپنے نفس کی جانب داری کا کوئی امکان باقی نہ رہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ، لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ، فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ، فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ. يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ، وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا، فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ، يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ، هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ، اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ، اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا، لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ. عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ، وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ، وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ. اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ، مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ، وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا، وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ.

(المائدہ ۵: ۹۴۔۹۶)

”ایمان والو، اللہ تمھیں اُس شکار کے ذریعے سے لازماً آزمائے گا جو تمھارے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں ہو گا، یہ دیکھنے کے لیے کہ تم میں سے کون غائبانہ اُس سے ڈرتا ہے۔ پھر جس نے اس تنبیہ کے بعد بھی حدود سے تجاوز کیا تو اُس کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ایمان والو، احرام کی حالت میں شکار نہ کرو، اور جو تم میں سے جان بوجھ کر ایسا کر گزرے تو اُس کا بدلہ اُس طرح کا جانور ہے، جیسا اُس نے مارا ہے۔ اس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے اور یہ نذرانہ کعبہ پہنچایا جائے گا۔ یا نہیں تو اِس گناہ کے کفارے میں مسکینوں کو کھانا کھلانا ہو گا یا اسی کے برابر روزے رکھنے ہوں گے تاکہ وہ اپنے کیے کی سزا چکھے۔ پہلے جو کچھ ہو چکا، اسے اللہ نے معاف کر دیا ہے، لیکن جو اِس کا اعادہ کرے گا، اللہ اُس سے انتقام لے گا (یہ اللہ کا فیصلہ ہے) اور اللہ زبردست ہے، وہ انتقام لینے والا ہے۔ دریا کا شکار اور اس کا کھانا تمھارے لیے حلال کیا گیا ہے، تمھارے لیے اور تمھارے قافلوں کے زادِ راہ کے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لیے اور خشکی کا شکار بدستور حرام ہے، جب تک تم احرام کی حالت میں ہو۔ (اس کی پابندی کرو) اور اُس اللہ سے ڈرتے رہو جس کے حضور میں تم سب حاضر کیے جاؤ گے۔''

چوتھا حکم یہ ہے کہ حج و عمرہ کے لیے سفر کرنے والے اگر کسی جگہ گھر جائیں اور ان کے لیے آگے جانا ممکن نہ رہے تو اونٹ، گائے، بکری میں سے جو میسر ہو، اس کی قربانی اسی جگہ کر دیں اور سر منڈوا کر احرام کھول دیں۔ ان کا حج و عمرہ یہی ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی کیا تھا۔[۴۱۶] اس معاملے میں یہ بات، البتہ واضح رہنی چاہیے کہ قربانی اس طرح کی کسی جگہ پر کی جائے یا مکہ اور منیٰ میں، اس سے پہلے سر منڈوانا جائز نہیں ہے، الاّ یہ کہ کوئی شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور وہ قربانی سے پہلے ہی سر منڈوانے پر مجبور ہو جائے۔ قرآن نے اجازت دی ہے کہ اس طرح کی کوئی مجبوری پیش آ جائے تو لوگ سر منڈوا لیں، لیکن روزوں یا صدقے یا قربانی کی صورت میں اس کا فدیہ دیں اور ان کی تعداد اور مقدار اپنی صواب دید سے جو مناسب سمجھیں طے کر لیں۔ روایتوں میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: تین دن کے روزے رکھ لیے جائیں یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دیا جائے یا ایک بکری ذبح کر دی جائے تو کافی ہو جائے گا۔[۴۱۷]

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ، فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ، وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُ وْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ، فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ، فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ. (البقرہ ۲: ۱۹۶)

''اور حج و عمرہ (کی راہ اگر تمھارے لیے کھول دی جائے تو ان کے تمام مناسک کے ساتھ اُن) کو اللہ ہی کے لیے پورا کرو، لیکن راستے میں گھر جاؤ تو ہدیے کی جو قربانی بھی میسر ہو، اُسے پیش کر دو، اور اپنے سر اُس وقت تک نہ مونڈو، جب تک یہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ پھر جو بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو اُسے چاہیے کہ روزوں یا صدقے یا قربانی کی صورت میں اُس کا فدیہ دے۔''

پانچواں حکم یہ ہے کہ باہر سے آنے والے اگر ایک ہی سفر میں حج و عمرہ، دونوں کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پہلے عمرہ کر کے احرام کھول دیں، پھر ۸/ ذوالحجہ کو مکہ ہی سے دوبارہ احرام باندھ کر حج کر لیں۔ یہ محض ایک رخصت ہے جو اللہ تعالیٰ نے دو مرتبہ سفر کی زحمت کے پیش نظر باہر سے آنے والے عازمین حج کو عطا فرمائی ہے۔ لہٰذا وہ اس کا فدیہ دیں گے۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

۴۱۶؎ بخاری، رقم ۱۸۰۷، ۱۸۱۱، ۱۸۱۲۔

۴۱۷؎ بخاری، رقم ۱۸۱۴۔ مسلم، رقم ۱۲۰۱۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اونٹ، گائے اور بکری میں سے جو جانور بھی میسر ہو، اس کی قربانی کی جائے۔

یہ ممکن نہ ہو تو دس روزے رکھے جائیں: تین حج کے دنوں میں اور سات حج سے واپسی کے بعد۔

اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہتر یہی ہے کہ حج کے لیے الگ اور عمرے کے لیے الگ سفر کیا جائے۔ چنانچہ قرآن نے صراحت کر دی ہے کہ یہ رعایت ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جن کے گھر در مسجد حرام کے پاس ہوں:

فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ، فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ اِلَی الۡحَجِّ، فَمَا اسۡتَیۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡیِ، فَمَنۡ لَّمۡ یَجِدۡ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ فِی الۡحَجِّ، وَسَبۡعَةٍ اِذَا رَجَعۡتُمۡ، تِلۡكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ. ذٰلِكَ لِمَنۡ لَّمۡ یَكُنۡ اَهۡلُهٗ حَاضِرِی الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ، وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ. (البقرہ ۲:۱۹۶)

”پھر جب امن کی حالت پیدا ہو جائے تو جو کوئی عمرے (کے سفر سے) یہ فائدہ اٹھائے کہ اس کے ساتھ ملا کر حج بھی کر لے تو اُسے قربانی کرنا ہو گی جیسی بھی میسر ہو جائے۔ اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو روزے رکھنا ہوں گے، تین حج کے زمانے میں اور سات (حج سے) واپسی کے بعد۔ یہ پورے دس دن ہوئے۔ (اس طریقے سے ایک ہی سفر میں عمرے کے ساتھ ملا کر حج کی) یہ (رعایت) صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر در مسجدِ حرام کے پاس نہ ہوں۔ (اِس کی پابندی کرو) اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔“

اس حکم کے بارے میں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ جو لوگ اس رعایت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں، ان کے لیے سہولت یہ ہے کہ وہ پھر ہدی کے جانور ساتھ نہ لائیں، بلکہ قربانی کے دن وہیں سے خرید لیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان جانوروں کی قربانی یوم النحر کو ہو گی اور جیسا کہ بیان ہوا، قربانی سے پہلے وہ سر نہیں منڈوا سکیں گے اور اس کے لازمی نتیجے کے طور پر احرام بھی نہیں کھول سکیں گے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی صورت پیش آ گئی تھی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

لو انی استقبلت من امری ما استدبرت ما اهدیت، ولو لا ان معی الهدی لاحللت. (بخاری، رقم ۲۵۰۵)

”مجھ پر وہ بات اگر پہلے واضح ہو جاتی جو اب ہوئی ہے تو میں ہدی کے جانور ساتھ نہ لاتا اور نہ لاتا تو میں بھی احرام کھول دیتا۔“

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ

[''المورد'' کے اسسٹنٹ فیلو جناب عمار خان ناصر کا مضمون ''مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ'' بالاقساط ''اشراق'' کے بعض گزشتہ شماروں میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون سے متعلق چند مکاتیب صاحب مضمون کو موصول ہوئے ہیں۔ یہ مکتوب اور ان کے جواب قارئین ''اشراق'' کے استفادے کے لیے شائع کیے جا رہے ہیں۔ ادارہ]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محترم محمد عمار خان ناصر صاحب

السلام علیکم

آپ اور مدیر ''اشراق'' مبارک باد کے مستحق ہیں کہ آپ حضرات نے ہیکل سلیمانی اور مسجد اقصیٰ کے متعلق اس دور میں کلمۂ حق بلند کیا، جب حق کی آواز بلند کرنے والا ہر شخص ''یہود کا ایجنٹ'' قرار پاتا ہے، اور پھر ایسا شخص نہ صرف مباح الدم قرار پاتا ہے، بلکہ اس کے خلاف جہاد بالسیف سب سے بڑا مذہبی فریضہ قرار پاتا ہے۔ خدا آپ کی سعی کو قبول کرے اور آج کے تمام مدعیان اسلام کو آپ ہی کی طرح حق کو دین اور دلیل کی کسوٹی پر پرکھ کر قبول کرنے اور باطل کو اسی پر پرکھ کر رد کرنے کی توفیق دے۔

آپ کے مضامین سے میرے ذہن میں چند سوالات پیدا ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ ان کے متعلق اپنی رائے سے آگاہ کریں گے:

۱۔ ہمارا اور بنی اسرائیل کا دین وہی اللہ کا بھیجا ہوا دین اسلام ہے۔ اگر کچھ فرق ہے تو تقاضائے حکمت کے تحت، شریعت میں کہیں کہیں کچھ اختلاف ہے۔ ان کی شریعت کی بعض سختیاں، بنی اسرائیل کی کج روی اور کج بحثی کی وجہ سے بطور سزا ان پر عائد کی گئیں۔ اللہ کی آخری شریعت میں یہ سختیاں منسوخ کر دی گئیں۔ اسی طرح بعض سنن بنی اسرائیل کے بجائے بنی

اسماعیل کے برقرار رکھے گئے، مثلاً ہفتہ کے بجائے جمعہ کا تقدس۔ سوال یہ ہے کہ ہیکل کی مقدس چٹان اگر بنی اسرائیل کی دینی روایت میں مقدس تھی تو ہماری شریعت میں کیوں ایسا نہیں، جبکہ اس چٹان کی اس مقدس حیثیت کو ہماری شریعت کی کسی نص نے منسوخ نہیں کیا؟ بلکہ اس کے برعکس یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قرآن نے ہیکل اور اس سے منسوب تمام اشیا کو شعائر میں سے قرار دیا ہو۔ چنانچہ شب معراج کے رؤیا کے متعلق قرآن فرماتا ہے:

''پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے دور کی مسجد (یعنی ہیکل سلیمانی) جس کے گرداگرد ہم نے برکت رکھی ہے تاکہ دکھائیں اسے اپنی نشانیاں۔''

اس آیت میں موجود الفاظ ''اپنی نشانیاں'' سے مراد کیا، دیگر نشانیوں کے علاوہ، ہیکل سلیمانی اور اس کے ملحقہ دیگر شعائر نہیں ہو سکتے؟ اگر ایسا مان لیا جائے تو اس کا مطلب ہے کہ محمدی شریعت، بنی اسرائیلی شریعت کے ان شعائر کو sanctity عطا کر رہی ہے۔

یہاں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ بنی اسرائیل کی شریعت کے شعائر کو محمدی شریعت کے شعائر قرار دینے سے میرا مقصد یہ ہے کہ مسلمان ان پر اپنا حق تولیت جمائیں، بلکہ یہ ہے کہ وہ ان کو اپنے ان بھائیوں سے share کریں جو ہماری ہی طرح خود بھی دین ابراہیم پر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، یعنی یہود اور مسیحی۔

۲۔ صخرہ کے قریب سیدنا عمر یا دیگر صحابہ کے نماز نہ پڑھنے سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ وہ شریعت محمدی میں شعیرہ نہیں ہے۔ چٹان کے قریب نماز نہ پڑھنے کی دیگر حکمتیں بھی ہو سکتی ہیں، مثلاً اس کی حیثیت قبلہ کے تصور کو مٹانا۔ ہیکل اور اس سے ملحق شعائر کی حیثیت قبلہ کو نص قرآنی نے منسوخ کر دیا ہے، مگر ان کے شعائر ہونے کی حیثیت کو قرآن نے رویائے شب معراج کا تذکرہ کر کے (reinforce) کیا ہے۔

۳۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی یہ رائے کہ ''اس (صخرہ) کی تعظیم طریقہ یہود کی مشابہت اختیار کرنے کے زمرے میں آتی ہے'' میری ناچیز رائے میں نظر ثانی کے قابل ہے۔ امام صاحب کے علمی مقام اور مرتبہ کو پیش نظر رکھا جائے تو مجھ ناچیز کو ان سے، ظاہر ہے وہ نسبت بھی نہیں جو قطرہ کو سمندر سے ہوتی ہے، مگر ان کی رائے پر تبصرہ نہ کرنا ان کے اپنے اسوہ کو ترک کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے یہ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ صخرہ کی تعظیم کیا صرف یہود سے مشابہت ہے؟ کیا یہ بے شمار انبیاے بنی اسرائیل کی، ان کے جان نثار ساتھیوں اور زمانۂ قدیم کے ان گنت سچے مسلمانوں کی مشابہت بھی نہیں؟ پھر یہود کی مشابہت اگر کوئی جرم ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دسویں محرم کا روزہ کیوں رکھتے تھے؟ کیا ایسا کرتے ہوئے وہ بنی اسرائیل کی شریعت کا اتباع نہیں کرتے تھے؟ امام صاحب فرماتے ہیں: ہماری شریعت میں جیسے ہفتے کے دن کے بارے میں کوئی حکم نہیں، اسی طرح صخرہ کے حوالے سے بھی کوئی خصوصی حکم باقی نہیں رہا۔'' ہفتہ کا حکم تو بنی اسماعیل کی سنت پر عمل کرنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منسوخ کر دیا، مگر صخرہ کے شعیرہ ہونے کا حکم آخر کس نص سے منسوخ ہوا؟ مزید یہ کہ رویائے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شب معراج میں جہاں آپ کو ہیکل دکھایا گیا، وہاں ہیکل کا Holy of holies یعنی صخرہ جو ہیکل کا اصل یا دل تھا، کیوں دکھانے سے رہ گیا؟ اور کچھ نہیں تو کم از کم یہ اس کا حصہ تو تھا ہی۔

۴۔ مسجد عبد الملک (یا مسجد عمر) اس احاطے میں تعمیر کی گئی ہے جس پر اصلاً یہود کا حق ہے، اس لیے اگر وہ اسے گرانا چاہیں تو کیا ہمیں اس پر کشت وخون کرنا چاہیے؟ پھر یہ مسجد ایک عام مسجد ہے۔ جو مسجد مسلمانوں کی تیسری مقدس مسجد ہے اور جس کی زیارت کے لیے سفر جائز ہے، وہ تو ہیکل سلیمانی ہے۔ اسی کے متعلق حدیث سے پتا چلتا ہے کہ یہاں مانگی جانے والی دعا کو شرف قبولیت بخشا جاتا ہے۔ تو پھر کیا ہمیں اس کی تعمیر یہود پر چھوڑ رکھنی چاہیے یا اس شرف کو خود حاصل کرنے میں پہل کرنی چاہیے۔ کیوں نہ ہم ہیکل خود حضرت سلیمان کے نقشہ پر تعمیر کر دیں؟ اور اگر یہود کے لیے یہ قابل قبول نہ ہو تو آخر ہم قبہ صخرہ کے مقدس حصے میں داخل ہونے کی سعادت سے محروم کیوں رہیں؟ احاطۂ ہیکل یہود کے حوالے کرنے کے بعد ہم مسجد عبد الملک تک کیوں محدود رہیں؟ ہم کیوں نہ ان سے درخواست کریں کہ وہ ہیکل میں اپنے طریقہ سے عبادت کریں اور ہمیں اپنے طریقے سے کرنے دیں۔ ہیکل کو اس دنیا میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ دنیا کے تین عظیم مذاہب یعنی یہودیت، مسیحیت اور اسلام کے پیروکاروں کے لیے انتہائی مقدس رہا ہے۔ یہ عالم انسانیت میں محبت، امن، رواداری، خدا ترسی اور حضرت ابراہیم کے پیروکاروں کے مذاہب کی مشترکہ دعوتی اساس کا مرکز بن سکتا تھا، مگر افسوس دین ابراہیمی کے درست ترین (version) کے حامل ہونے کے دعویٰ داروں نے اسے نفرت، عدم برداشت اور قتل وغارت کا مرکز بنا دیا۔

والسلام

محمد عزیر بھور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی محمد عزیر بھور صاحب

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ بے حد شکریہ۔

مسجد اقصیٰ سے متعلق میرے نقطۂ نظر کے حوالے سے آپ نے جو استفسارات کیے ہیں، ان کے بارے میں میری گزارشات حسب ذیل ہیں:

۱۔ صخرۂ بیت المقدس کے تقدس اور اس کی حرمت وعظمت کے بارے میں آپ کے ارشاد سے مجھے پوری طرح اتفاق ہے۔ یہ یقیناً ایک محترم اور مقدس پتھر ہے اور اس کی حرمت کو اسی طرح ملحوظ رکھا جانا چاہیے جیسا کہ پورے احاطۂ ہیکل کی حرمت وتقدس کو۔ ہمارے فقہا جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات کی بنا پر رفع حاجت کے وقت مسجد حرام کی طرف

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رخ کر کے بیٹھنے کو ممنوع قرار دیتے ہیں، وہاں صخرہ کے استقبال واستدبار سے گریز کو بھی مستحب مانتے ہیں۔ اسی طرح 'تغلیظ الیمین بالمکان'، یعنی قسم کو موکد بنانے کے لیے کسی مقدس مقام میں حلف لینے کے مسئلے میں بھی ان کے ہاں بیت اللہ اور مسجد نبوی کے ساتھ ساتھ صخرۂ بیت المقدس کا ذکر ملتا ہے۔ تاہم اس ضمن میں دو باتیں ملحوظ رہنی چاہییں۔ ایک تو وہی جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، یعنی یہ کہ کسی چیز کی حرمت وتقدس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی تولیت کے حق دار بھی لازماً مسلمان ہیں اور دوسری یہ کہ مسلمانوں کے لیے صخرہ کی عظمت وحرمت محض اعتقادی اور اصولی نوعیت کی ہے۔ اس سے تجاوز کرتے ہوئے اس کی رسمی (Ritualistic) تعظیم کا کوئی طریقہ (مثلاً صخرہ کا طواف یا عبادت کی نیت سے اس کو چھونا یا اہتمام سے اس کے قریب نماز پڑھنا وغیرہ) صاحب شریعت سے کسی ثبوت کے بغیر اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ امام ابن تیمیہ بھی، جہاں تک میں ان کی رائے پر غور کر سکا ہوں، اسی رسمی تعظیم کو یہود کی مشابہت قرار دیتے ہیں۔ ہاں، اگر وہ اس کی اعتقادی اور اصولی حرمت کی بھی، فی الواقع، بالکلیہ نفی کرتے ہوں تو پھر البتہ، ان کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ آپ کی یہ رائے کہ مسلمان ازخود ہیکل سلیمانی کو تعمیر کر کے پورے احاطۂ ہیکل کو مسلمانوں اور یہود کی مشترکہ عبادت گاہ کی حیثیت دے دیں، غالباً مثالیت پسندانہ (Idealistic) ہے۔ اگر ایسا کرنے میں کوئی حقیقی نظری یا عملی رکاوٹ نہ ہوتی تو آپ کی بات قابل غور تھی، لیکن صورت حال یہ ہے کہ جانبین کے متعصّبانہ عملی رویے سے قطع نظر، یہودی فقہ کی رو سے کسی غیر یہودی کا ہیکل کی اصل عمارت میں داخلہ ہی سرے سے ممنوع ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ ان کے مذہبی علما اس فقہی شرط سے دست بردار ہو کر آپ کی تجویز کو قبول کرنے کے لیے رضامند ہوں گے۔ اگر آپ غور کریں تو مسئلے کا عملی حل اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا جس کا میں نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے۔ آپ کا بتایا ہوا طریقہ اگر مطلوب یا افادیت کے ساتھ قابل عمل ہوتا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس کو چھوڑ کر مسلمانوں کے لیے مسجد کا ایک کونا مخصوص کر دینے کا طریقہ اختیار نہ فرماتے۔

اگر مزید کوئی بات وضاحت طلب ہو تو میں اس کے لیے حاضر ہوں۔

عمار ناصر

محترمی عمار ناصر صاحب

السلام علیکم

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ کا عنایت نامہ ملا جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

یہودی فقہ میں چونکہ اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ غیر یہودی ہیکل کی عمارت میں داخل ہو سکے، اس لیے ظاہر ہے ہم اصل مسجد اقصیٰ کی عمارت نہ تو تعمیر کرنے کی سعادت حاصل کر سکتے ہیں، نہ اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہی تجویز

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قابل عمل رہ جاتی ہے جو آپ نے پیش کی ہے۔صورت حال کی وضاحت کے بعد مجھے آپ کی رائے سے پورا اتفاق ہے۔

خاکسار

محمد عزیز بھور

محترم ومکرم جناب عمار خان ناصر صاحب

السلام علیکم!

... سورۂ سرا کی پہلی آیت بے حد اہمیت کی حامل ہے،لیکن بدقسمتی سے اس پر روایات کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ میری درخواست ہے کہ اس پر بھی تحقیق فرما کر ان پردوں کو ہٹائیں،جیسا کہ آپ نے مسجد اقصیٰ کے متعلق کی ہے۔قرآن کریم کے موجودہ تراجم ایک ہی طرح کے ہیں،جن سے میرے جیسے کم علم کو ماسوائے عقیدت و عجز کے کچھ پلے نہیں پڑتا۔ایک ترجمہ وتفسیر خواجہ احمد الدین امرتسری صاحب کا بھی ہے۔وہ دوسرے علما کرام سے مختلف ہے،لیکن اس میں بھی مجھ کم علم کی دانست میں تاویل سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ممکن ہے درست ہی ہو۔انھوں نے 'اقصا المدینة' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔یہ صحیح ہیں یا غلط،ان پر بھی آپ ہی روشنی ڈال سکیں گے...۔

نیاز آگیں

آفتاب عروج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی آفتاب عروج صاحب

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں مذکور 'المسجد الاقصیٰ' کے مصداق سے متعلق آپ کے استفسار کے جواب میں عرض ہے کہ مجھے اس باب میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے بیت المقدس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعمیر کردہ مسجد ہی مراد ہے۔جن لوگوں نے محض اس کے لغوی معنی یعنی ''دور کی مسجد'' کو ملحوظ رکھتے ہوئے مکہ مکرمہ سے دور واقع کسی اور مسجد کو اس کے مصداق کے طور پر متعین کرنے کی کوشش کی ہے،انھوں نے آیت کے سیاق کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔واقعۂ اسرا سے گفتگو کا آغاز کر کے اللہ تعالیٰ نے اسی سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بنی اسرائیل کو تورات جیسی نعمت عطا کرنے اور پھر اس سے روگردانی کی پاداش میں ان پر مسلط کی جانے والی دو تاریخی تباہیوں کا ذکر کیا ہے۔اسی ضمن میں آیت ۷ میں ہیکل سلیمانی کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے 'ولیدخلوا المسجد' کے الفاظ آئے ہیں۔عربی زبان کے قاعدے کے مطابق اگر

ایک مسلسل اور مربوط کلام میں ایک ہی لفظ دو مقامات پر معرفہ کی صورت میں استعمال ہوا ہو تو دونوں جگہ اس کا مصداق لازمی طور پر ایک ہی ہوتا ہے۔ اس اصول کی رو سے پہلی آیت میں 'المسجد الاقصی' اور ساتویں آیت میں 'و لیدخلوا المسجد' کا مصداق کسی طرح سے بھی الگ الگ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جہاں تک سورۂ بنی اسرائیل کے موضوع اور مضامین کے ساتھ اس 'ابتدائیہ' کے تعلق کا سوال ہے، تو وہ بالکل واضح ہے۔ سورہ میں مشرکین مکہ اور یہود دونوں کو مشترک طور پر مخاطب بنایا گیا ہے اور اس ابتدائیہ میں دونوں کو ان کے انجام کی تصویر دکھا دی گئی ہے۔ یہود کو سابق سورہ، النحل کی آیت ۹۴ میں یہ وارننگ دی گئی تھی کہ اگر وہ دین حق کے خلاف اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو سرزمین عرب میں ان کو ایک عرصے سے باعزت اور پر امن زندگی گزارنے کا جو موقع میسر ہے، وہ ان سے چھین لیا جائے گا۔ 'فتزل قدم بعد ثبوتها و تذوقوا السوء بما صددتم عن سبيل الله' اسی دھمکی کو سورۂ بنی اسرائیل کے آغاز میں زیادہ واضح صورت میں اور تاریخی شواہد کی تائید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کے محاسبہ کی یہی تفصیل بعینہٖ مشرکین کے لیے بھی سبق آموز ہے، کیونکہ اس میں یہ صاف اشارہ موجود ہے کہ جس طرح تورات سے انحراف اور بے دینی کے نتیجے میں بنی اسرائیل کو ہیکل سلیمانی کی تولیت سے محروم کیا گیا، مشرکین بنی اسمٰعیل سے بھی مسجد حرام کی تولیت کا حق عن قریب بالکل اسی طرح چھین لیا جائے گا۔

باقی رہا خواجہ احمد الدین صاحب کا یہ استدلال کہ چونکہ سورۂ بنی اسرائیل کے نزول کے وقت حضرت سلیمان علیہ السلام کی مسجد موجود نہیں تھی، اس لیے وہ اس کا مصداق نہیں ہو سکتی تو اس کی غلطی میں اپنے مضمون میں واضح کر چکا ہوں۔ 'مسجد' دراصل عمارت کو نہیں، بلکہ اس قطعہ زمین کو کہتے ہیں جسے عبادت گاہ کے طور پر مخصوص کر دیا جائے۔ عمارت ایک اضافی اور ثانوی چیز ہے۔ اگر کسی وقت عمارت قائم نہ رہے تو بھی مسجد کی حیثیت سے اس قطعہ زمین کا تقدس اور احکام برقرار رہتے ہیں۔

امید ہے کہ یہ وضاحت باعث تشفی ہو گی۔

عمار ناصر

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org